مطبوعات دارالمصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین اعلیٰ پایہ کی مذہبی تاریخی اور ادبی کتابیں گذشتہ ۴۷ سال سے شائع کر رہا ہے اس ادارہ کو مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے، اسکی بقاصرف اسکی مطبوعات کی فروخت پر ہے۔ اس لئے اسکی کتابوں کو خرید کر کے اس ادارہ کو نہ صرف خود کفیل بنائیں بلکہ اس کو اپنی گذشتہ روایات کے ساتھ مذہب اور علم و فن کی شاندار خدمات انجام دینے کا موقع دیں۔

مطبوعات کی فہرست طلب کرنے پر ارسال ہوگی۔

منیجر

جلد ۸۹ - ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۸۰ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۲ء عدد ۳

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ متحدہ ہندوستان کی ایک اہم شخصیت شعیب قریشی صاحب نے کراچی میں انتقال کیا، وہ ہندوستان کے ممتاز رہنماؤں میں تھے، انکی عمر کا بڑا حصہ ملک وملت کی خدمت میں گذرا، انکی قومی زندگی کا آغاز مشہور انگریزی اخبار نیو ایرا کی مضمون نگاری سے ہوا تھا جس کے وہ بعد میں اڈیٹر بھی ہوگئے تھے، پھر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے زمانہ میں مشہور انصاری مشن کیساتھ ٹرکی گئے، ۱۹۲۰ء میں جب وفد خلافت لندن گیا تھا تو وہ وہاں زیر تعلیم تھے، اسلیے وفد کی کارروائیوں میں عملی حصہ لیا، اسی زمانہ میں خلافت اور کانگریس کی تحریکیں شروع ہوئیں، لندن کی واپسی کے بعد ان میں سرگرمی سے حصہ لیا، ایک عرصہ تک خلافت کمیٹی کے سکریٹری بھی رہے، اور کچھ دنوں گاندھی جی کی غیر حاضری میں انکے اخبار ینگ انڈیا کے بھی اڈیٹر رہے، حجاز پر سلطان عبدالعزیز آل سعود کے قبضہ کے بعد وہاں کے حالات کی تحقیقات اور اسکے آئندہ نظام حکومت کے بارہ میں مشورہ دینے کیلئے خلافت کمیٹی کی جانب سے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن شعیب قریشی بھی تھے، پھر نہرو کمیٹی میں مسلمانوں کی نمایندگی کی، مگر اسکی رپورٹ سے انھوں نے اختلاف کیا اور سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہوکر ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم ہوگئے، اپنے دور وزارت میں انھوں نے بہت سے مفید تعلیمی اور مذہبی کام انجام دیے، ریاست بھوپال کے خاتمہ کے بعد پاکستان چلے گئے اور مختلف اوقات میں مرکزی حکومت کی وزارت اور سفارت کے عہدوں پر ممتاز رہے، علمی قابلیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے بھی بہت بلند اور پختہ کیرکٹر کے انسان تھے، ادھر چند سال سے انکا ذکر سننے میں نہیں آتا تھا، ایک دن دفعۃً انکے انتقال کی خبر سنی، انکی ذات سے ملک وملت کو بڑے فوائد پہنچے، اللہ تعالی اس خادم قوم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

ہندستان کا ہنگامہ خیز جنرل الیکشن ختم ہوگیا، ہم کو اسکے سیاسی نتائج سے بحث نہیں، صرف قومی اتحاد و یکجہتی کے نقطۂ نظر سے اسکو دیکھنا ہے، اس پہلو سے اگر نظر ڈالیجائے تو اس سے بڑا سبق ملتا ہے، ہندوستان کی دو بڑی لعنتیں ہیں، فرقہ پروری اور ذات پات کی تقسیم جہانتک انکی زبانی مخالفت کا تعلق ہے، کانگریس اور حکومت دونوں اس میں کمی نہیں کرتیں، خصوصاً پنڈت جواہر لال نہرو اسکی پرزور مخالفت کرتے رہتے ہیں لیکن محض زبانی نمایش کبھی کارگر نہیں ہوسکتی، اس لیے یہ دونوں لعنتیں برابر بڑھتی جاتی ہیں، اور الیکشن کے زمانہ میں اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہیں۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے اس کا سارا الزام انگریزی حکومت کے سر تھوپ دیا جاتا تھا کہ فرقہ پروری کی آگ انہی کی بھڑکائی ہوئی ہے، اس لیے آزادی کے بعد خود بخود ختم ہوجائیگی اور قومی اتحاد و یکجہتی کا سنہرا دور شروع ہوگا، اس سے انکار نہیں کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے مصالح کی بنا پر فرقہ پرستی کو ابھارنے کی کوشش کی، لیکن اس کا سارا الزام انہی پر لگانا صحیح نہیں ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ غلامی کے دور کی بہت سی خرابیاں آزادی کے بعد ختم ہوجاتی ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اتنی فرقہ پروری اور طبقاتی تفریق انگریزوں کے زمانہ میں بھی نہ تھی جستقدر اب ہے، آزادی کے بعد گھٹنے کے بجائے بڑھتی جاتی ہے اور آزادی کی دیوی کی عمر میں اضافہ کے ساتھ قیامت بنتی جاتی ہے۔

ہم کو سارے ہندوستان سے بحث نہیں، صرف اتر پردیش ہمارے سامنے ہے، جہاں کے ہندو مسلمان تہذیب و معاشرت میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھے، اور آج کے مقابلہ میں ان میں اتحاد و اتفاق بھی زیادہ تھا، فرقہ پروری کا گڑھ بنتا جاتا ہے، الیکشن کی تیاری میں مغربی اضلاع کے مسلمانوں پر جو کچھ گذری وہ سب کی نگاہ کے سامنے ہے، الیکشن میں مسلمانوں کو انکی آبادی کے تناسب سے بہت کم پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ٹکٹ ملے، پھر ان میں بھی اکثروں کو فرقہ پرور جماعتوں کے نمایندوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی، بلکہ یہانتک سنا جاتا ہے کہ بعض مقامات پر خود کانگریسیوں نے کانگریس کے مسلمان امیدوار کے مقابلہ میں فرقہ پرور جماعتوں کے امیدواروں کی خفیہ مدد کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس الیکشن میں اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد دو تہائی کے قریب گھٹ گئی، ابھی صحیح اعداد و شمار تو معلوم نہیں ہوئے لیکن یقین ہے کہ دس بارہ سے زیادہ نہ ہوگی، حالانکہ اس صوبہ میں ان کی تعداد اسی لاکھ سے اوپر ہے۔ کانگریس کے ہندو امیدواروں کو بھی جن سنگھیوں نے شکست دی، اس کے مقابلہ میں جن سنگھیوں کی تعداد پہلے سے تگنی کے قریب زیادہ ہوگئی ہے، اور اب حزب مخالف وہی ہوگی، اگر اس کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو دو ایک الیکشن کے بعد اس صوبہ

میں جن سنگھ کی حکومت قائم ہو جائے، اس خطرہ کو اب کانگریسی بھی محسوس کر رہے ہیں جس کی جانب مسٹر گپتا نے اپنی ایک تقریر میں اشارہ کیا ہے۔

یہی حال ہندوؤں میں طبقاتی تقسیم اور ذات پات کی تفریق کی ترقی کا ہے جس کی ذمہ داری ایک حد تک کانگریس پر عائد ہوتی ہے، وہ اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے ٹکٹ دینے میں حلقہ انتخاب کی برادری کا بھی لحاظ کرتی ہے، جو قومیت کی تعمیر کے لیے مضر ہے، پھر الیکشن کے موقع پر مختلف برادریوں اور پارٹیوں کے امیدوار اپنی کامیابی کے لیے ذات پات کے تعصب کو بھڑکاتے ہیں، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا الیکشن نے اس تفریق کو بڑھایا ہے کسی چیز نے نہیں بڑھایا ہے، اس سے ہندوؤں کی مختلف برادریوں میں ایک دوسرے کے خلاف اس قدر تعصب بڑھ گیا ہے کہ اگر مسلمان درمیان میں نہ ہوتے تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا سبب کانگریس اور حکومت کی خود غرضی ہے، کانگریس کا مقصد اب ملک اور عوام کی بے لوث خدمت اور اصلاح کے بجائے صرف حکومت رہ گیا ہے، اسلیے وہ کسی ایسی چیز کی مخالفت نہیں کر سکتی جس سے اسکی حکومت کے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے، حکومت بھی اسی خوف سے فرقہ پروروں اور ذات پات کی تفریق کے خلاف کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکتی، دوسرا سبب بالغ رائے دہندگی ہے جو جمہوریت کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی اصولی کیوں نہ ہو لیکن ہندستان جیسے ملک کے لیے جس کی نوے فیصدی آبادی جاہل اور غیر تربیت یافتہ ہے، اور جو اپنی رائے کے صحیح استعمال کا کیا ذکر بالٹ بکس میں ووٹ ڈالنے کا بھی شعور نہیں رکھتی، بالکل غیر موزوں ہے، یہ ضروری نہیں کہ جس قسم کی جمہوریت اور الیکشن کا جو طریقہ انگلینڈ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں کے لیے موزوں ہے بعینہ وہی ہندستان کے لیے بھی موزوں ہو، تیسرا سبب ترقی پسند پارٹیوں کا آپس کا اختلاف ہے، اگر وہ سب ملکر فرقہ پرور جماعتوں کا مقابلہ کریں تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں، انکے اختلاف اور مقابلہ سے فرقہ پروروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، یہ تنہا کسی اقلیت یا فرقہ کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے، اگر حکومت نے فرقہ پروری اور ذات پات کی تقسیم کے خلاف کوئی موثر قدم نہ اٹھایا تو وہ کانگریس کی حکومت کے ساتھ پورے ملک کو لے ڈوبے گی،

مقالات

اسلام میں علم و حکمت کا آغاز

از
جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی، بی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

[اعتذار: مسلمانوں نے اپنے شرعی اور لسانی علوم (منقولات) کی ترقی کے لیے جو خدمات شائستہ انجام دیں اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن علوم حکمیہ (معقولات) کے سلسلے میں ان کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کما حقہ نہیں کیا گیا، اسلیے سطور ذیل میں اسلامی ثقافت کے اسی پہلو کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے، علوم شرعیہ اور عربی ادب کے ارتقاء کا صرف سرسری طور پر حوالہ دیا گیا ہے، مگر یہ ترک تفصیل کسی بے اعتنائی کا نتیجہ نہیں ہے، شرعی علوم اسلامی ثقافت کی اصل ہیں اور عربی زبان امت اسلامیہ کے اتحاد ملی کی ضامن ہے، اس لیے اس کی عظمت و اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ۔]

ریگ زار عرب کے نیم متمدن بادیہ نشینوں نے جو اسلام سے پہلے اجتماعی زندگی کے تصور سے بھی ناآشنا تھے، اسلام کا حلقہ بگوش ہونے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں معمورۂ عالم کے بہت بڑے حصہ میں ایک منظم سلطنت تعمیر کر لی جو تاریخ کا بہت بڑا معجزہ ہے، مگر اس سے بھی عظیم تر معجزہ یہ ہے کہ وہ قوم جس کا امتیازی وصف اسلام سے پہلے جاہلیت تھا، مشرف باسلام ہونے کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مشرق و مغرب کے علمی خزانوں کی وارث ہو گئی، تاریخ کے اس اعجوبہ کا راز خود دعوت اسلام میں مضمر ہے،

(۱) اسلام اور علم و حکمت کی ہمت افزائی

حصول علم کی ترغیب اپنے مستند معنوں میں اسلام کا آغاز اس دن سے ہوتا ہے جبکہ جبرئیل امین جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہلی مرتبہ وحی الٰہی لیکر حاضر ہوئے، اور اس وحی الٰہی کا آغاز اقرأ کے ایجابی امر سے ہوا:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

پڑھ اپنے رب کے نام کیساتھ جس نے سب کچھ پیدا کیا،

اور انسان پر معبود برحق کی سب سے بڑی نعمت یہ بتائی گئی کہ اس نے اس نادان کو دانائی سکھائی۔

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ
بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ
يَعْلَمْ

پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے
علم سکھایا، اور انسان کو وہ سکھایا جو نہیں
جانتا تھا

اسلامی آئیڈیالوجی کے رو سے خلاق کائنات نے انسان کو نعمت وجود [تخلیق] سے نوازنے کے بعد سب سے پہلے "علم اسماء" کی دولت سے مالامال کیا، یہ وہ دولت تھی جس سے ملائکہ بھی تہی دامن تھے، قرآن کہتا ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا
ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ
أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ، قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ
لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ
الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ۔

اور اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آدم کو سب (چیزوں)
کے نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا،
اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ،
انھوں نے کہا تو پاک ہے، جتنا علم تو نے ہمیں
بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں، بیشک
تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔

اسی آئیڈیالوجی کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے پہلے ہی دن سے "عقلیت" کی اہمیت پر زور دیا، قرآن اپنے مخاطبین سے عقل و خرد اور فہم و تدبر کے استعمال کا بار بار مطالبہ کرتا ہے، "أَفَلَا تَعْقِلُونَ، أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ، أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُونَ" اسکی دعوت کا عام جزء ہے، اسی معقولیت پسند تعلیم کا نتیجہ ہے کہ وہ کورانہ تقلید کو جو امم ماضیہ میں عام تھی شرک سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ قرآن پچھلی مذہبی برادریوں کے بارے میں کہتا ہے،

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ
أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (توبہ - ۳۱)

انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو
اللہ کے سوا خدا بنا لیا،

کیونکہ علم و حکمت کے ان خود ساختہ اجارہ داروں نے خدا کے بندوں کو اوہام باطلہ کا شکار بنا رکھا تھا جن کے بار گراں سے ان کی مضطرب انسانیت دبی جا رہی تھی مگر نکل نہ سکتی تھی، جس طرح وہ سوسائٹی کے چھوٹے ٹھیکہ داروں کے معاشی دستبرد سے زبوں حال تھی مگر راہ مفر نہ پاتی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس کو اپنے ہی ابنائے نوع کی ذہنی و معاشی غلامی سے آزاد کیا، قرآن کہتا ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ
الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

اور نبی ان کے اوپر سے ان کا بوجھ اور ان پر
جو قیدیں تھیں اتارتا ہے،

اس کے ساتھ انسانوں کی حریت نفس کے استقرار اور ان کی انسانیت کو بلند کرنے کے لیے انھیں ایجابی طور پر مامور کیا کہ خود کو اس زیور شائستگی سے متحلی کریں جس کا نام علم ہے، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

طلب العلم فریضة علی کل
مسلم و مسلمة

علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور مسلمان
عورت پر فرض ہے

خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف قرآن کسی جبروت شاہنشاہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ

"معلم کتاب و حکمت" کی حیثیت سے کراتا ہے اور اس "معلم برحق" کی بعثت کو مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت بتاتا ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ — (اللہ تعالیٰ) نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے

بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ — کہ ان میں انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا ہے

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ — جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ — اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ — اور حکمت سکھاتے ہیں، اور پہلے تو یہ

مُّبِيْنٍ (آل عمران - ۱۷) — لوگ صریح گمراہی میں تھے،

اسلام نے اقدار حیات کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں علم و حکمت کو زندگی کی قدر اعلیٰ (خیر کثیر) قرار دیا گیا ہے :-

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ — اور جس کو سمجھ ملی اس کو بڑی

اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ - ۳۷) — خوبی ملی۔

لہٰذا وہ دوسرے سماجوں کی طرح سوسائٹی کی تقسیم نسلی امتیاز یا مال و دولت کے اصول پر نہیں کرتا بلکہ دانائی اور نادانی کی بنیاد پر کرتا ہے :-

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ — کہہ دیجئے کہ کیا جو لوگ جانتے ہیں اور

وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ — جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں،

اس کے یہاں سوسائٹی میں بلند ترین مقام دیوتاؤں کی اولاد یا اہل ثروت کو حاصل نہیں ہے، بلکہ "خدا سے ڈرنے والوں کو" ہے

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات - ۲) — تم میں اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے،

اور "تقویٰ اور خوف و خشیت الٰہی" صرف اہل علم کا حصہ ہے :-

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ — بیشک اللہ کے بندوں میں سے علما

الْعُلَمٰٓؤُا — اللہ سے ڈرتے ہیں۔

اس ترغیب و تشویق کا فطری نتیجہ تھا کہ اسلام کے پیروؤں میں حصول علم کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ قوم جس کا امتیازی وصف اسلام لانے سے پہلے "جاہلیت" تھا، مشرف باسلام ہونے کے بعد کچھ ہی دن میں مشرق و مغرب کے علمی خزانوں کی وارث ہو گئی کیونکہ ان کے رسول نے انھیں بتا دیا تھا کہ علم و حکمت مرد مومن کی متاع گم گشتہ ہے،

الكلمة الحكمة ضالة المؤمن — دانائی کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں

اينما وجدها فهو احق بها — بھی اسکو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے،

اور انھیں ایجابی طور پر مامور کیا تھا کہ

اطلبوا العلم ولو كان بالصين — علم کو تلاش کرو خواہ چین میں ملے،

اپنے رسول کے اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے بحر و بر ناپ ڈالے علم و حکمت کے موتیوں کی تلاش میں بستیاں اور ویرانے چھان ڈالے اور اپنی سعی پیہم اور جہد مسلسل سے آخرکار آج کی متمدن دنیا کے استاد قرار پائے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم اور تسخیر کائنات کی تشجیع

اسلام اور سائنس آج کی متمدن دنیا میں جمیع ضدین معلوم ہوں تو ہوں، لیکن اسلام کی بنیادی تعلیم کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ اس کے پیرو طبیعیاتی علوم میں کمال حاصل کریں۔ اسکی تفصیل حسب ذیل ہے :-

اسلام کی بنیادی تعلیم "توحید و ربوبیت" ہے، اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیشمار پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے :-

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا نُوْحِیْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ
اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء۔۲۵)

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول
مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ کسی کی بندگی نہیں
سوائے میرے پس میری بندگی کرو،

اور یہی پیغام لیکر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۲)

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے
پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے
تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (بقرہ ۱۹)

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود
نہیں اس کے سوا، بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

قرآن اس "توحید ربوبیت" کو ایک تکوینی حقیقت کی طرح نہیں بیان کرتا، وہ اپنے متبعین کو ایجابی طور پر حکم دیتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت سے خود کو بچائیں:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّآ اِيَّاهُ (بنی اسرائیل)

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو
اس کے سوا،

وہ کسی طرح اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ وہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکائیں، یہ ایسا جرم ہے جو ناقابل عفو ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ
بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ
يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ (نساء)

بیشک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک
ٹھہرائے، اس کے سوا جس کو چاہتا ہے
بخشدیتا ہے، اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (نساء) وہ سخت گمراہ ہوا،

یہ "توحید ربوبیت" اسلام کی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے اور یہی "توحید ربوبیت" اسلامی ثقافت اور اسلامک کلچر کا اصل الاصول ہے: یعنی "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ بالفاظ دیگر اللہ رب العزت کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں، سب اس کے محکوم ہیں۔ کائنات کی وہ سب سے افضل اور اشرف مخلوق ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ (بنی اسرائیل) اور ہم نے عزت دی ہے آدم کی اولاد کو،

دنیا میں اشرف المخلوقات ہونے کا یہ احساس اس کی اخلاقی بلندی اور خودی وخودداری کا ضامن ہے، دنیا کی ہر چیز اس کے واسطے پیدا کی گئی ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ
جَمِيْعًا (بقرہ ۳۰)

وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے
جو کچھ زمین میں ہے سب،

اور وہ صرف خلاق کائنات کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا
لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات)

اور ہم نے نہیں پیدا کیا جن اور انسان کو
مگر اپنی عبادت کے لیے.

اس تعلیم کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ پیروان اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور کائنات کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کریں، اسی کا نام تسخیر کائنات ہے جس کے لیے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ
عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مسخر کر دیے جو کچھ
تمہارے لیے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور
تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دیں۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے

اور ممکنہ غلط فہمیوں سے تحفظ کے لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ علم وحکمت میں کسی طرح کا امتیاز نہیں ہو سکتا، وہ مرد مومن کا ورثہ اور اس کی متاع گم گشتہ ہے، جہاں ملے وہ اس کے لے لینے کا حقدار ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے:

کلمة الحکمة ضالّة المومن
اینما وجدها فهو احق بها

دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے، جہاں بھی اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

اسلام اور علوم طبیعیہ کی ہمت افزائی اسلام صرف "اقتضاء بالنص" ہی پر اکتفا نہیں کرتا، وہ ایجابی طور پر اپنے متبعین کو مامور کرتا ہے کہ وہ مظاہر کائنات کا مشاہدہ کریں کیونکہ ان میں سوچنے اور سمجھنے والوں کی رہنمائی کے لیے نشانیاں ظاہر و باہر ہیں۔ قرآن کہتا ہے:-

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ
قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (یونس)

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے انکو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

یہی نہیں بلکہ وہ اس فریضہ سے پہلوتہی کرنے والوں پر زجر و توبیخ کرتا ہے:-

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ
شَیْءٍ وَّاَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ
اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ
بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، اور اس بات میں (بھی غور نہیں کیا) کہ ممکن ہے کہ انکی اجل قریب ہی آپہنچی ہو، پھر قرآن کے بعد کونسی بات پر یہ لوگ ایمان لاویں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ
الْفُلْکُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (جاثیہ)
وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی
الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (جاثیہ)

اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے دریا کہ چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو، اور مسخر کر دیا گیا تمہارے لیے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں۔

لیکن کائنات کی زندہ اور بیجان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی، ہاتھی کو اٹھا کر نہیں پٹکا جا سکتا، بلکہ انکس کے ذریعہ قابو میں لایا جاتا ہے، دریا کا زور ہاتھوں سے پانی کو جھکولے دے کر نہیں توڑا جا سکتا بلکہ ٹربائن کے ذریعے اس کی توانائی کو بجلی کی شکل میں ذخیرہ کیا جاتا ہے، پہاڑ کو گھونسوں سے نہیں توڑا جا سکتا بلکہ ڈائنامیٹ کے ذریعے اس میں شگاف ڈالے جاتے ہیں اور سرنگیں کھود دی جاتی ہیں، سمندر کی لہروں کے سامنے نہیں ٹھہرا جا سکتا بلکہ کروزر اور سب میرین کے ذریعے طوفانی سمندر میں بھی بے خطر سفر کیا جا سکتا ہے، یہ سب کیا ہے صرف تسخیر ارض وسموٰت اور کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت ہے، اسی کا نام "علم طبیعی" اور "نیچرل سائنس" ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے دینی علوم کے ساتھ جو آنے والی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہیں، طبیعیاتی علوم کے حصول کو بھی ضروری سمجھا، ان کے رسول کا حکم تھا

اطلبوا العلم ولو کان بالصین — علم کو تلاش کرو خواہ چین میں لے،

ظاہر ہے کہ چین اور جاپان میں حاصل ہونے والا علم اللہ اور اس کے رسول کی معرفت کا علم تو ہوگا نہیں، اس کے لیے تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کافی تھی، یہ صرف دنیوی علم ہی ہو سکتا ہے،

اسلامی آئیڈیالوجی میں تکمیل ایمان "ایمان بالآخرۃ" پر موقوف ہے، اور اس حقیقت کے ایقان کے لیے تخلیق کائنات کا مطالعہ اور اس مطالعہ کے لیے سیر و سیاحت ضروری ہے، قرآن کہتا ہے:

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

آپ (ان لوگوں سے) فرما دیجئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اول بار پیدا کیا، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کریگا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور اس فریضہ کی بجاآوری میں کوتاہی کرنے والوں سے وہ بازپرس کرتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اول بار پیدا کرتا ہے (کہ عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی دوبارہ اس کو پیدا کریگا، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے۔

تقا اور انابت الی اللہ جو ایمان کا اعلیٰ وارفع مرتبہ ہے اس کی تکمیل مظاہر کائنات اور ان کے تبدل و اختلاف کے مطالعہ کے ساتھ مشروط ہے:

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ

بلاشبہ رات و دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے (توحید کے) دلائل ہیں جو (خدا کا) ڈر مانتے ہیں۔

تخلیق ارض و سماوات کا مطالعہ اور مظاہر کائنات کے دوری اختلافات کا مشاہدہ ان اولی الالباب کا شعار ہے جنھوں نے "ذکر اللہ" کو اپنا وظیفۂ حیات بنا لیا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران رکوع ۲۰)

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل (توحید کے) موجود ہیں، اہل عقل کے استدلال کیلیے جنکی یہ حالت ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس مخلوق کو لایعنی پیدا نہیں کیا،

تاریخ کا یہ ناقابل تردید واقعہ ہے کہ قرآن کریم نے جو اصولاً ایک "مذہبی کتاب" ہے، ان تمام علوم کی تشجیع و ہمت افزائی کی جو آج اور آئندہ "طبیعیاتی علوم" کے تحت میں محسوب ہوں گے۔ مثلاً قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلکیاتی مشاہدہ ملت اسلامیہ کا مقدس ترین ورثہ ہے۔ اسی نے ہمارے جد امجد سیدنا ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی چشم جہاں بیں کو نور توحید سے روشن کیا، بقول اقبال ؎

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

قرآن کہتا ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي

پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انھوں نے ایک ستارا دیکھا، آپ نے فرمایا کہ (یہ تمھارے زعم کے موافق) یہ میرا رب ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ غروب ہو جانے والے

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنۡ لَّمۡ یَهۡدِنِیۡ رَبِّیۡ
لَاَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّيۡنَ
فَلَمَّا رَاَ الشَّمۡسَ بَازِغَةً قَالَ
هٰذَا رَبِّىۡ هٰذَاۤ اَكۡبَرُ فَلَمَّاۤ اَفَلَتۡ
قَالَ يٰقَوۡمِ اِنِّىۡ بَرِىۡۤءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ
اِنِّىۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِىَ لِلَّذِىۡ فَطَرَ
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا وَّمَاۤ
اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (انعام)

سے محبت نہیں رکھتا، پھر جب چاند کو دیکھا
چمکتا ہوا تو فرمایا (تمھارے زعم کے موافق)
یہ میرا رب ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو
تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھکو میرا رب (حقیقی) ہدایت
نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں
پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ
(تمھارے زعم کے موافق) یہ میرا رب ہے،
یہ تو سب میں بڑا ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا
تو آپ نے فرمایا اے قوم بےشک میں تمھارے شرک
سے بیزار ہوں، میں اپنا رخ اس (ذات)
کی طرف (کرنا تم سے ظاہر) کرتا ہوں،
جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا
اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

چنانچہ جب آیۂ کریمہ اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ کا نزول ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ویل لمن لا کھا بین لحیتیه ولم یتفکر فیها"

اور یہ رجحان خود علمائے دین میں بھی آخر تک برقرار رہا، چنانچہ امام غزالی کا مشہور قول ہے:۔

من لم یعرف الھیئة والتشریح
فھو عنین فی معرفة اللہ تعالیٰ

جو شخص علم الہیئت اور علم التشریح نہیں جانتا
وہ معرفت باری تعالیٰ میں ناقص ہے۔

کہتے ہیں امام غزالی کے معاصر حکیم ابو الحسن الانبیری (استاذ عمر خیام) مجسطی پڑھا رہے تھے، کسی فقیہ نے پوچھا کیا پڑھا رہے ہو، فرمایا آیۂ کریمہ

اَفَلَمۡ يَنۡظُرُوۡۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ
كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا (ق)

کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف
آسمان کو نہیں دیکھا،

کی تفسیر کر رہا ہوں۔

اسی طرح قرآن دیگر طبیعیاتی علوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے:۔

اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ
للمومنین وفی خلقکم وما یبث
من دابة آیات لقوم یوقنون
واختلاف اللیل والنھار وما
انزل اللہ من السماء من رزق
فاحیا به الارض بعد موتھا
وتصریف الریاح آیات
لقوم یعقلون
(جاثیه)

آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے واسطے
کے لیے بہت دلائل ہیں اور (اسی طرح)
خود تمھارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں
جن کو زمین پھیلا رکھا ہے دلائل ہیں ان لوگوں
کے لیے جو یقین رکھتے ہیں (اسی طرح) یکے بعد دیگرے
رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس (رزق)
رزق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا
پھر اس (بارش) سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے
خشک ہوئے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے
بدلنے میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل
(سلیم) رکھتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ مظاہر کائنات میں معرفت باری تعالیٰ کی نشانیوں کے علاوہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے اور بھی کچھ ہے، کیونکہ کائنات و ما فیہا ان کی میراث ہے، اس لیے انھیں اس کی تسخیر کا طریقہ جاننا چاہیے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا	اور اسکے بعد زمین کو بچھایا (اور بچھاکر) اس سے
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا	اسکا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو
وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا. مَتَاعًا لَّكُمْ	(اس پر) قائم کردیا تمھارے اور تمھارے مویشیوں
وَلِاَنْعَامِكُمْ (نازعات)	کے فائدہ پہنچانے کے لیے۔

لہذا انسان کو تمتع بالکائنات کے ساتھ اس عمل الٰہی پر بھی نظر رکھنا چاہیے جو کائنات میں جاری و ساری ہے، قرآن کہتا ہے:۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ	سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے
اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا. ثُمَّ شَقَقْنَا	کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر
الْاَرْضَ شَقًّا. فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا	زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور
حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا	اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ
وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّ	اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعضی چیزیں)
فَاكِهَةً وَّاَبًّا مَتَاعًا لَّكُمْ	تمھارے اور (بعضی چیزیں) تمھارے مواشی
وَلِاَنْعَامِكُمْ (التکویر)	کے فائدے کے لیے۔

وہ مظاہر کے ساتھ کائنات حیوانی کے مطالعہ پر بھی برانگیختہ کرتا ہے کیونکہ یہی اسلام کے مشن کی تکمیل کا صحیح راستہ ہے اور اسی کی مدد سے ایمان تک رسائی ہوتی ہے:۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ	کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر)
خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ	پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کس طرح بلند
وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ	کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح
وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ	کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ	کس طرح بچھائی گئی ہے، تو آپ (بھی انکی فکر میں
(غاشیہ)	نہ پڑیے بلکہ صرف نصیحت کر دیا کیجئے (کیونکہ)
	آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔

اسی طرح وہ تاریخ طبیعی اور حیوانیات کے مطالعہ کی تشجیع کرتا ہے:۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ	اور اللہ (تعالیٰ ہی) نے ہر چلنے والے جاندار کو
فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَ	(بری ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں
مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ	بعضے تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ	چلتے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو دو پیروں
يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى	پر چلتے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو چار (پیروں)
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (نور)	پر چلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بناتا ہے
	بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پورا قادر ہے۔

ایک اور مقام پر وہ حیوانات کے تشریحی اور فعلیاتی مطالعہ کی ہمت افزائی کرتا ہے:۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً	اور (نیز) تمھارے لیے مواشی میں بھی
نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ	غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو
بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا	گوبر اور خون (کا مادہ) ہے اسکے درمیان
سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ (نحل)	میں صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا
	دودھ (بناکر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

دوسری جگہ اڑنے والی مخلوقات کے تحقیقی مطالعہ پر برانگیختہ کرتا ہے:۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ	کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں کی طرف

صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ؕ — نظر نہیں کی کہ پھیلائے ہوئے (اڑتے پھرتے)
مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ — ہیں اور کبھی اسی حالت میں) پر سمیٹ لیتے ہیں
اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ — بجز خدائے رحمٰن کے ان کو کوئی تھامے ہوئے
(ملک) — نہیں ہے، بیشک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

دیگر علوم عقلیہ کی ہمت افزائی طبیعی علوم کے ساتھ قرآن عقلی علوم کی بھی ترغیب دیتا ہے، علم کلام کی تشجیع کے لیے وہ حکم دیتا ہے

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل) — اور انکے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجیے،

فلسفہ کے لیے وہ "حکمت" کو قدرِ اعلیٰ [خیر کثیر] کا مصداق بتاتا ہے:۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ — اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جائے
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا — اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

جہانتک منطق کا تعلق ہے خود قرآن کریم کا پیرایۂ بیان اقناعی کے بجائے برہانی ہے اور علم البرہان کے ان قواعد و قوانین کی مراعات پر مشتمل ہے جو فطرت انسانی کے مطالعہ سے آج تک دریافت ہوئے ہیں، یا آیندہ دریافت ہوں گے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ — ہم نے اسی صلاح آخرت کے لیے) اپنے پیغمبروں کو کھلے
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ — احکام دیکر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ — کرنے کے حکم، کو نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ
بِالْقِسْطِ (الحدید) — اور حقوق العباد میں اعتدال پر قائم رہیں۔

علمائے ربانیین نے اس "میزان قرآنی" سے موازین معرفت مستنبط کیے ہیں، چنانچہ امام غزالی نے آیۂ کریمہ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ میں جن قسطاس مستقیم کا ذکر کیا ہے، اس کی تشریح

کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

هي الموازين الخمس التي انزلها — وہ موازین پنجگانہ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے
الله في كتابه وعلم انبياءه الوزن — اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے اور اپنے رسولوں
بها. فمن تعلم من رسول الله صلى الله — کو ان سے وزن کرنا سکھایا، پس جس نے
عليه وسلم ووزن بميزان الله — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا اور اللہ تعالیٰ
فقد اهتدى ومن ضل عنها — کی میزان سے وزن کیا تو اس نے ہدایت پائی
الى الرأي والقياس فقد ضل — اور جو اس سے گمراہ ہو کر رائے اور قیاس سے
وتردى — بھٹک گیا وہ گمراہ ہوگیا،

قرآن اپنے متبعین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے جملہ اعمال تفکر و رویت میں ان "موازین قرآنی" کی مراعات کریں

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ — اور صحیح ترازو سے تول کر دو۔

اس راست اندیشی اور "استقامت فی الفکر" سے بھٹکنے کو وہ ممنوع قرار دیتا ہے

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَ — تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور انصاف اور
اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا — (حق رسانی) کے ساتھ وزن ٹھیک رکھو،
تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (الرحمن) — اور تول کو گھٹاؤ مت۔

اس تعلیم قرآنی کا تحقق اولین اللہ کے رسول کی ذات بابرکات میں ہوا، اسی نے آپ کو افصح العرب بنا دیا، اس لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات گرامی جو صناعۂ منطق کی جانب مشیر تھے، انھیں اکثر علماء نے مدون کیا، ان تالیفات میں سے ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء کے اندر ابو نصر فارابی کی حسب ذیل کتاب کا ذکر کیا ہے:۔

کلام جمعه من اقاويل النبي صلى الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں سے
عليه وسلم يشير فيه الى صناعة	ان باتوں کو جمع کیا ہے جس میں صناعۃ منطق
المنطق	کیجانب اشارہ پایا جاتا ہے،

اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ بحث و نظر اور افہام و تفہیم کو اسلامی معاشرے میں شروع ہی سے مقبولیت حاصل رہی ہے، تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملیں گے کہ دو مسلمان عشاء کی نماز پڑھ کر نکلے کہ کسی مسئلہ میں مناظرہ چھڑ گیا، اور مسجد کے دروازے ہی پر کھڑے کھڑے فجر کی اذان ہو گئی، غرض علماء و فقہاء نے قرآنی تعلیمات سے حجج عقلیہ کے استعمال کو مستنبط کر کے اس کے استحسان پر زور دیا ہے، مثلاً آیۂ کریمہ:

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا	اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت
عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن	جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر
مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم	تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا
مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ	ہم پلہ ہو اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو جو خدا سے
	الگ تجویز کر رکھے ہیں۔

سے امام ابوبکر جصاص الرازی حجج عقلیہ کے استعمال اور دلائل و براہین سے استدلال کے "امر" کو ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال ابوبكر رحمه الله وقد	ابوبکر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیتیں ان چیزوں
تضمنت هذه الآية مع ما ذكرنا	کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے [مثلاً دلائل
من التنبيه على دلائل التوحيد	توحید اور اثبات نبوۃ پر تنبیہ] عقلی حجتوں
واثبات النبوة "الامر" باستعمال	اور دلائل کے ساتھ استدلال کے امر پر بھی
حجج العقول والاستدلال	مشتمل ہیں اور یہ ان لوگوں کے مذہب کو

بدلائلها وذلك يبطل مذهب	باطل کرتا ہے جو دلائل الٰہی سے استدلال
من نفى الاستدلال بدلائل	کے منکر ہیں اور اپنے گمان میں معرفت باری
الله تعالى واقتصر على الخبر	کے باب میں صدق رسول کے علم کے ساتھ
بزعمه في معرفة الله في العلم	صرف حدیث ہی پر اقتصار کرتے ہیں، ہماری
بصدق رسول الله صلى الله	دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی توحید
عليه وسلم لان الله تعالى لم يقتصر	کی معرفت اور اپنے رسول کی سچائی
فيما دعا الناس اليه من معرفة	کی دعوت دی ہے اس میں صرف
توحيده وصدق رسوله	خبر ہی پر اکتفا نہیں کیا بغیر اس کے
على الخبر دون اقامة دلائل	کہ اس کی صحت پر عقلی دلائل
على صحته من جهة عقولنا	قائم کیے ہوں۔

اس کا فطری نتیجہ تھا کہ اکابر علمائے اسلام میں منطق کو ہمیشہ مقبولیت حاصل رہی، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ "مقاصد الفلاسفہ" میں فرماتے ہیں:-

واما المنطقيات فاكثرها على	رہے منطقی مباحث تو ان میں سے اکثر
نهج الصواب والخطاء نادر	صحیح و صائب ہوتے ہیں اور ان میں
فيها	غلطی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ حصول سعادت اور تزکیہ و تخلیہ روح کے لیے وہ منطق کو ایجابی طور پر ضروری سمجھتے ہیں

فاذا فائدة المنطق اقتناس	بس منطق کا فائدہ حصول علم ہے اور علم کا
العلم وفائدة العلم حيازة	فائدہ ابدی سعادت کا حصول ہے پس جبکہ
السعادة الابدية فاذا صح	کمال نفس میں سعادت کا تزکیہ و تخلیہ

رجوع السعادة الی کمال النفس — کی طرف رجوع کرنا صحیح ہے تو

بالتزکیة والتحلیة صار المنطق — لامحالہ منطق بڑے فائدہ کی چیز

لا محالة عظیم الفائدة — ہوگا،

امام غزالیؒ سے پہلے ابن حزم اندلسی نے ارسطا طالیسی منطق کے متعلق لکھا تھا،

والکتاب الذی جمعها ارسطاطالیس — اور وہ کتابیں جنھیں ارسطو نے حدود

فی حدود الکلام ...... — کلام میں جمع کیا ہے وہ سب کی سب

کلها کتب سالمة دالة علی توحید — مکمل کتابیں ہیں جو اللہ عزوجل کی توحید

الله عزوجل وقدرته عظیمة — اور قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور تمام

المنفعة فی انتقاد جمیع العلوم — علموں کی جانچ پرتال میں بہت زیادہ مفید ہیں

غالباً یہی وجہ تھی کہ جونہی عہد عباسی میں غیر زبانوں سے علوم و فنون کی کتابیں عربی میں منتقل کرنے کی تحریک شروع ہوئی، فن منطق کو عربی میں ترجمہ کرنے کی جانب خصوصیت سے توجہ کی گئی، اور منطق کے ساتھ غیر معمولی طور پر شغف و انہماک بڑھ گیا، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) صدر اسلام اور علم حکمت کا آغاز

اسلام کا ثقافتی پس منظر اسلام کا ثقافتی پس منظر بڑا ہی تاریک ہے، عرب جہاں خورشید اسلام کی پہلی کرن چمکی، ثقافتی پسماندگی کی تاریک ترین منزل سے گزر رہا تھا، اور واقعی "جاہلیت" کا مصداق تھا، غالباً فردوسی کا یہ طعنہ بیجا نہ تھا:۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسیدہ است کار

کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

ہاں اس کی غلطی یہ تھی کہ وہ اس عرب کو بھی جس کے رگ و پے میں اسلام نے ایک نئی روح

پھونک دی تھی، اسی عرب جاہلیت کی طرح سمجھتا تھا، جسے اپنے جہل پر عار نہیں بلکہ فخر تھا اور جس کا اعلان تھا کہ خبردار ہم سے کوئی جہالت نہ برتے ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہیں:۔

الا لا یجهلن احد علینا — فنجهل فوق جهل الجاهلینا

اسلام جب عرب میں مبعوث ہوا اس وقت پورے ملک میں سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے عربوں کی لغت شاہد ہے کہ نہ وہ کتاب سے واقف تھے اور نہ تحریر کتابت سے۔ حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے صرف وہی جان سکتے تھے، جو انھوں نے اپنے ماحول میں دیکھا تھا، کتاب کے مفہوم سے ناآشنا تھے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:۔

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ — آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے

البتہ اہل عرب کتاب کے بجائے "کتیبہ" کو خوب جانتے تھے، جس کے معنی لشکر ہیں، مگر خدا کی قدرت دیکھئے، اسی وحشیانہ لفظ سے ان کے یہاں وہ لفظ بنا جو تہذیب و ثقافت کی کلید ہے یعنی "کتاب" قاضی ناصر الدین بیضاوی نے اپنی تفسیر میں کتاب کے اشتقاق کے متعلق لکھا ہے:۔

واصل الکتب الجمع — "کتب" کی اصل جمع ہے اور اسی لیے لشکر کو

ومنه الکتیبة" — "کتیبہ" کہتے ہیں (کیونکہ وہ ملا ہوا ہوتا ہے)

عہد نبوی اور تعلیم و تعلم کا آغاز یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے کہ اس نے تحصیل علم کے ساتھ تعلیم و تعلم اور نوشت و خواند پر بھی زور دیا، اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ قرآن خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف ایک معلم کتاب و حکمت کی حیثیت سے کراتا ہے، آنحضرتؐ خود اس باب میں غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے، جو لوگ مشرف با سلام ہوتے تھے ان کی تعلیم کے لیے خاص انتظام کرتے تھے، جو قبائل مسلمان ہو جاتے تھے انھیں علم دین سکھانے کے لیے مخصوص اہل علم صحابہ کو بھیجتے تھے، ہر قبیلہ میں سے ایک وفد تحصیل علم کے لیے مدینہ منورہ آتا تھا، اور اس نظام کے فروغ کے لیے قرآن حکیم کہتا ہے:۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ

سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ انکی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد) میں جایا کرے تاکہ (یہ باقی ماندہ لوگ) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں، تاکہ یہ لوگ اپنی (اس قوم کو) جبکہ وہ انکے پاس واپس آئیں ڈرائیں تاکہ وہ (ان سے دین کی باتیں سنکر برے کاموں سے) احتیاط رکھیں

اسلام نے نوشت وخواند کی اہمیت پر بھی زور دیا، عربوں میں پڑھے لکھے آدمیوں کی کمیابی کا اوپر ذکر آچکا ہے کہ بعثت اسلام سے قبل پورے ملک میں صرف سترہ آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے، لیکن اسلام نے اپنی تعلیم کا آغاز جیسا کہ اوپر ذکر ہوا "پڑھ" کے ایجابی حکم (اقرأ) سے کیا، اور اس کے ساتھ اپنے متبعین کو مامور کیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں "لکھنے" سے کام لیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ

اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد معین تک (کے لیے) تو اس کو لکھ لیا کرو

اس طرح نوشت وخواند مسلمانوں کا ایک دینی فریضہ بن گئے، اس میں مرد وعورت، شریف وضیع اور امیر وغریب کا کوئی امتیاز نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے میں تعلیم اور نوشت وخواند کو غیر معمولی اشاعت ہوگئی، حالانکہ اقوام قدیمہ میں سے بہت سی قوموں نے تعلیم کو صرف مخصوص طبقات ملک کے لیے مخصوص کر دیا تھا، اور دوسرے طبقات کو اس سے محروم قرار دیا تھا، لیکن اسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی تعمیم میں کسی بخل کو روا نہ رکھا،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تحریر وکتابت کی تعلیم کے ساتھ جو اہتمام فرماتے تھے، اس کا اندازہ

اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں جو قیدی گرفتار ہوکر آئے اور ان میں سے جو لوگ زرفدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے حضورؐ نے انھیں حکم دیا کہ ہر ایسا شخص مدینہ منورہ کے دس بچوں کو نوشت وخواند سکھلادے یہی اس کا فدیہ ہے، آپ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ یہودی کی زبان سیکھیں، اور انھوں نے چھ مہینے کے اندر اس زبان کو سیکھا، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلام نے عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کے سیکھنے کی بھی ہمت افزائی کی ہے۔

خلافت راشدہ اور علم وادب کی ترقی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوئے، خلیفہ ہونے کے بعد آپ کو ایک جانب فتنۂ ارتداد سے اور دوسری جانب مدعیان نبوت کی دسیسہ کاریوں سے مقابلہ کرنا پڑا، ان میں سخت مقابلہ مسیلمہ کذاب سے ہوا اور اس مقابلہ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے، شہداء میں اکثر حفاظ قرآن تھے، اس سے اکابر صحابہ کو بڑا صدمہ پہنچا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب صدیق اکبرؓ کو اس خطرناک صورت حال سے مطلع فرمایا اور کہا کہ فوراً قرآن حکیم کو جمع کرنے اور ایک کتاب میں مدون کرنے کا انتظام کریں، پہلے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس "نئے کام" کے کرنے میں متردد رہے کہ وہ کام کس طرح کریں، جسے خود ان کے آقا ورسولؐ نے نہیں کیا تھا، لیکن بعد کو وہ اس کی اہمیت کو سمجھ گئے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صحابۂ کرام کی ایک جماعت سے بڑی احتیاط کے ساتھ قرآن حکیم کو ایک کتاب میں جمع کرا دیا۔

اس طرح مسلمانوں میں جو پہلی کتاب مدون ہوئی وہ "اللہ کی کتاب" تھی۔

اس کے بعد شمع رسالت کے پروانوں نے اپنے ہادی ورہنما کے اقوال واعمال کو قلمبند کیا، حدیث رسول کے ان قدیم مجموعوں میں حضرت علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مجموعے زیادہ مشہور ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ۱۳ھ میں وفات پائی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے

جانشین ہوئے، اسلامی فتوحات جن کا آغاز خلافت صدیقی میں ہوا تھا، عہد فاروقی میں بھی جاری رہیں، اور مال غنیمت میں بے شمار روپیہ آنے لگا۔ اس غرض سے آپ نے بیت المال قائم کیا،

بیت المال میں روپیہ رکھنے اور تقسیم کرنے کے لیے حساب دانی کی ضرورت تھی، نیز معاشرہ کی اقتصادی حالت بھی سنبھل گئی تھی اور لوگ ترکہ میں بڑی بڑی رقوم چھوڑنے لگے، اس طرح مناسخہ کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے، تجارتی لین دین بھی بہت بڑھ گیا، ان سب عوامل کے پیش نظر علم الحساب کو خاصی ترقی ہوئی،

۱۶ھ میں سواد کا علاقہ فتح ہوا، جسے آپ نے فاتحین میں تقسیم کرنے کے بجائے مفتوحین ہی کے قبضہ میں خراج پر رہنے دیا، تشخیص خراج کے لیے زمین کی پیمائش کی گئی، یہ کام حضرت عثمان بن حنیفؓ نے انجام دیا، اس طرح مساحت اور ہندسہ کی ابتدا ہوئی،

حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ کے جانشین ہوئے، آپ کے عہد میں دولت و ثروت کی اور بھی فراوانی ہو گئی، فتوحات اسلامی کا دائرہ دور دور تک پھیل گیا، مختلف ممالک کے طرح طرح کی زبانیں بولنے والے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اس سے قرآن کی قرأت میں اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا، اس لیے حضرت عثمانؓ نے مصحف صدیقی کی نقلیں کرا کے مختلف ممالک میں بھیجدیں۔

حضرت عثمانؓ کا آخری زمانہ فتنہ و فساد کا زمانہ تھا، جس کے نتیجہ میں باغیوں نے آپ کو شہید کر دیا، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تخت خلافت پر بٹھایا، ان کا زمانہ بھی جنگ جمل، جنگ صفین، تحکیم اور جنگ نہاوند میں گذرا، بایںہمہ اسلام کی تاریخ میں آپ علم و حکمت کے مظہر اور "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" کے مصداق تھے، اکثر علمی مسائل کا حل آپ کی خداداد ذہانت سے منسوب ہے، مثلاً "مسئلۂ منبریہ" جو علم الفرائض میں "عول" کا ایک منلق اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔

گو سب سے بڑا کارنامہ نحو کی ایجاد ہے، ابو الاسود دؤلی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایما سے اسے مدون کیا،

چنانچہ ابن الندیم لکھتا ہے :-

قال محمد بن اسحاق زعم اکثر العلماء ان النحو اخذ عن ابی الاسود الدؤلی وان ابا الاسود اخذ ذلک عن امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام	محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ اکثر علماء کا خیال ہے کہ نحو ابو الاسود دؤلی سے حاصل کیا گیا اور ابو الاسود دؤلی نے اسے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے حاصل کیا،

ابن الندیم نے اور بھی اقوال نقل کیے ہیں، مگر اختلاف اقوال کے باوجود اتنا مسلّم ہے کہ نحو عربی الاصل ہے اور اس کی ایجاد [وضع] بغیر بیرونی اثر کے [بلکہ بیرونی اثرات (یعنی یونانی منطق) کے مسلمانوں میں داخلہ سے قبل] صرف فصحائے عربیت کے حلقوں میں ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر دی بوائر کا یہ خیال کہ

"اہل عرب مثل اور بہت سے علوم کے علم لسان کا بھی بانی علی کو قرار دیتے ہیں، ملکہ ارسطو کی ایجاد کردہ کلام کی تین اجزاء میں تقسیم بھی انھیں کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔"

حرف بہ حرف صحیح ہے، اگرچہ اس نے شک کے انداز میں لکھا ہے، اس نے اس تشکیک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی ہے کہ "نحو عربی" جو مسلمان عبقریت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے ان کے ذاتی ابتکار فکر کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ارسطاطالیسی منطق سے ماخوذ ہے، اس کے لیے اس نے دوسرا انداز اختیار کیا ہے :-

"ابن المقفع نے جو خلیل نحوی کا دوست تھا پہلوی زبان میں منطق اللسان پر جو کچھ موجود تھا اس کا عربی میں ترجمہ مہیا کر دیا۔"

یعنی خلیل نے ابن المقفع سے ارسطو کی "باری ارمینیاس [Pari Hermaenetical]

کا مضمون لیکر اپنے شاگرد رشید سیبویہ کو پڑھایا، جس نے اس کی مدد سے اپنے مشہور شاہکار "کتاب سیبویہ" مرتب کی، اس افسانہ کی تائید میں اس نے (دی بوائرنے) "کتاب سیبویہ" سے پہلے عربی نحو کی کتابوں کا فقدان بتایا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:۔

"کیونکہ پہلی چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ سیبویہ کی مکمل صرف ونحو ہے، یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے جسے آگے چل کر متاخرین ابن سینا کے قانون کی طرح متعدد فضلاء کی کوشش کا نتیجہ قرار دینے پر مجبور ہوئے۔"

لیکن دو باتیں قابل غور ہیں:۔

(۱) سیبویہ سے پہلے اس کے استاد خلیل بن احمد نے نحو کے مسائل اور اصول کو بالالتزام مرتب کیا تھا اور خلیل سے پہلے خلیل کے استاد نے علم نحو میں "کتاب الجامع" اور "کتاب المکمل" لکھی تھیں جو علم نحو کے آفتاب و ماہتاب کا درجہ رکھتی تھیں:۔

بطل النحو جمیعاً کلہ   غیر ما احدث عیسیٰ بن عمر

ذالک اکمال وھذا جامع   فھما للناس شمس وقمر

اس لیے "کتاب سیبویہ" علم نحو کی پہلی جامع کتاب نہیں ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ابن الندیم کے زمانہ میں "جامع" اور "مکمل" نایاب ہو چکی تھیں۔

(۲) ثعلب کی روایت میں "کتاب سیبویہ" کو بیالیس علمائے نحو کی کوشش کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کتاب کے اصول و مسائل خلیل ہی سے ماخوذ ہیں، ابن الندیم لکھتا ہے:۔

"والاصول والمسائل للخلیل"

اور خلیل کا علم عیسیٰ بن عمر الثقفی کی علمی کاوشوں کا تسلسل ہے جس کی کتابوں کو خود خلیل علم نحو کا آفتاب و ماہتاب اور جن کے مضمون کو علم نحو کا حرف آخر بتاتا ہے۔

بنابریں دی بوائر کی یہ تشکیک خیز "تحقیق" کسی طرح درخور اعتنا نہیں ہے۔ پھر جو امر اس باطل کوشش کے ابطال کے لیے سب سے زیادہ دلیل قاطع ہے یہ ہے کہ جب ۳۲۰ھ میں وزیر ابن الفرات کے مکان پر ابو سعید سیرافی نحوی اور ابو بشر متی بن یونس منطقی کے درمیان نحو اور منطق کی افضلیت کے باب میں جو مناظرہ ہوا تھا، اگر عربی نحو یونانی منطق سے ماخوذ ہوتی تو اہل منطق ضرور کہتے کہ اے نحویو! تم کس بات پر فخر کرتے ہو؟ آیا اس نحو پر جو خود یونانی منطق سے ماخوذ ہے؟ بلکہ جو کچھ ابو سعید سیرافی نے اس مناظرے میں کہا اور جس سے ابو بشر متی بن یونس انکار نہیں کرسکا یہ ہے کہ منطق یونانی زبان کے ساتھ مخصوص ہے اور عربوں اور دوسری غیر یونانی اقوام کے لیے واجب الاتباع نہیں ہے۔

(باقی)

آزاد بلگرامی

از جناب عبد الرزاق صاحب قریشی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

(۳)

آزاد کے حالات زندگی کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انھیں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا، اور ان کی عمر کا کافی حصہ سیر و سفر میں گذرا، لیکن ارض پاک سے لوٹنے اور دکن میں قیام کرنے کے بعد ان کی سیاحت دکن کے علاقہ تک محدود رہی۔

دوسری خاص بات جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے وہ ان کی بے نیازی ہے، اگرچہ ان کی عمر کا بڑا حصہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی رفاقت میں گذرا، لیکن انھوں نے اس رفاقت سے نہ کوئی اعزاز حاصل کیا اور نہ جاگیر، نواب کے ساتھ ان کی رفاقت حقیقت میں خود نواب کی ان سے عقیدت کی بنا پر تھی، وہ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں کہ

"ہر چند با امرا ارتباط دارم و با رؤسا اختلاط، اما رشتۂ استغنا نگسیختہ ام و آبروی فقر بر در اغنیا نریختہ، بلے عندلیب را از مصاحبت گل زری و ماہی را از مجالست صدف گوہری مطمح نظر نمی باشد و دریں معنی زمزمہ می سنجم:

حباب مشت من از گوہری منت نمی آید
نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم"[1]

اس سلسلہ میں انکا ایک بیان جو شفیق نے اپنے تذکرہ میں دیا ہے، نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ

۱۔ آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۳

"بیت اللہ کی زیارت سے لوٹنے کے بعد میں نے اپنے دل میں سوچا کہ فقیری کئی قسم کی ہوتی ہے، مجھے کونسی اختیار کرنی چاہیے، بہت کچھ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مشیخت کے بندھن سے تو بہر حال آزاد رہنا چاہیے، البتہ جادۂ صدق پر چلنا اور معاملات کو صاف رکھنا ضروری ہے، کیونکہ معاملات دنیوی میں ورع کو فروغ نہیں ہوتا، اور معاملات دینی میں تو اور بدتر حال ہوتا ہے، چنانچہ کرامات گوئی، خواب اور سلسلۂ پیری و مریدی اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ نا قابل اصلاح ہوگیا ہے، سچائی اور خوش معاملگی عنقا ہو رہی ہے اور عرس بدعتوں کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے"[1]

شفیق لکھتے ہیں کہ آزاد کہا کرتے تھے کہ عرس کو بے کمالوں نے اپنی شہرت اور عوام کو بیوقوف بنانے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔[2]

آزاد کہتے ہیں کہ نفع دو طرح کا ہوتا ہے، ایک اخروی اور دوسرا دنیوی، صلۂ دنیوی دنیاداروں کی مداحی سے ملتا ہے اور صلۂ اخروی مدحت نبوت و اکابر دین سے نصیب ہوتا ہے، میں نے مدحت رسول میں اشعار کہے ہیں اور اس طرح اپنی شفاعت کے لیے ایک وسیلۂ قوی پیدا کر لیا ہے۔

چوں مدح رسول کام من شد
حسان الہند نام من شد[3]

جہاں تک امراء و اغنیاء کی مدح کا تعلق ہے، آزاد کا یہ دعویٰ ہے کہ

این دریوزہ گر فیض الہی در تمام عمر خود لب بمدح امیری نکشودہ و نامۂ خود بستائش دولتمندی سیاہ ننمودہ و دریں باب ہوئی می کشم۔

مہر بر لب کرد آزاد از ثنائے اغنیاء
نیست ارباب دول را بہرہ از دیوان ما[4]

اپنی بے نیازی اور استغناء سے متعلق لکھتے ہیں کہ

۱۔ شفیق: گل رعنا ۲۔ ایضاً ۳۔ آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۴ ۴۔ ایضاً ص ۳

"از آں روزی کہ ناصیۂ اخلاص با آستان بیت اللہ آشنا شد بیگانگی از رسوم ابنائے روزگار ہم رسیدہ و معنی تخلص آزاد بقدر استوار جلوہ افروز گردید"[1]

آزاد کا یہ بیان دلچپی سے پڑھا جائے گا کہ لسان الغیب نے ساڑھے تین سو برس پہلے میرے نام اور تخلص کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا،

فاش می گویم واز گفتۂ خود دلشادم | بندۂ عشقم واز ہر دو جہان آزادم

اس کی تاویل وہ یوں کرتے ہیں کہ اصطلاح صوفیہ میں عشق عبادت ہے ذات حق سے اور امیر المومنین حضرت علیؓ "مظہر کامل ذات الہی و نسخۂ شامل صفات نامتناہی" ہیں اس لیے عشق کا اطلاق ان پر (حضرت علیؓ پر) بھی ہوتا ہے اور اس طرح غلام علی اور بندۂ عشق ایک ہی ہے[2]

ایک مقطع میں فرماتے ہیں

گرچہ غلام علی از ہمہ آزاد شد | فہم کن از نام او بندۂ حیدر بود

نواب نظام الدولہ ناصر جنگ سے آزاد کے بڑے گہرے تعلقات تھے، خود آزاد کے الفاظ ہیں

"فقیر را با نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید...... ربط عجبی اتفاق افتاد و موافقتی کہ بالاتر ازاں متصور نباشد دست بہم داد"[3]

خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں کہ

"با فقیر نواب نظام الدولہ محبت و اخلاص فوق البیان بود و از ابتدائے ملاقات تا انتہائے ایام حیات مثل من آزاد را در دام حسن خلق خود مقید داشت۔ ہر چند خواستم کنارہ گیرم نگذاشت غفر لہ"[4]

نواب ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انکی سفارشوں کو اکثر و بیشتر قبول کر لیا کرتے تھے۔ لیکن ان تعلقات کے باوجود انھوں نے نواب کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ایک موقع پر ایک

[1] آزاد: مآثر الکرام ص ۱۶۳ [2] آزاد: یدبیضا [3] آزاد: مآثر الکرام ص ۱۶۳ [4] آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۵۵

قطعہ ان کی تعریف میں لکھا تھا جو حقیقت میں اظہار اخلاص تھا، اس کی شان نزول خود آزاد کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ ایک دن میں اور نواب ہاتھی پر سوار جا رہے تھے، ہم دونوں کے ہاتھی برابر برابر چل رہے تھے، اور آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے، دوران گفتگو میں جبل احد کی حدیث (ھذا جبل یحبنا ونحبہ) کا ذکر آگیا، میں نے حدیث کے الفاظ کو نظم کر دیا اور اس طرح نواب کو مجھ سے جو اخلاص ہے اسے الفاظ حدیث کے ذریعہ ظاہر کیا[1]، وہ قطعہ یہ ہے:

ھو ناصر الاسلام سلطان الوری | ابقاہ فی العیش المخلد ربہ

حاز المناقب والمآثر کلھا | جبل الوقار یحبنا ونحبہ

اس طرح آزاد نے ساری عمر میں ایک رباعی اور ایک قطعہ کہا جسے عام زبان میں مدح گستری کہا جا سکتا ہے، لیکن خود ان کی تاویل کے مطابق رباعی زیارت بیت اللہ کے شوق کی بیتابی کا نتیجہ تھی، اور قطعہ سے اظہار خلوص و محبت مقصود تھا۔ دنیاوی منفعت نہ پہلے سے مقصود تھی اور نہ دوسرے سے۔

اگر آزاد چاہتے تو اپنے رسوخ و اثر سے بڑے سے بڑا منصب حاصل کرکے دولت کا انبار لگا سکتے تھے، کیونکہ فرمانروایان دکن ان کے بڑے معتقد تھے اور ان کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے تھے[2]

لیکن ان کی طبیعت میں ایسا استغنا، تھا کہ انھوں نے جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کا کبھی خیال ہی نہیں کیا، نواب آصف جاہ کے انتقال کے بعد جب نواب نظام الدولہ دکن کے فرمانروا ہوئے تو ان کے دوستوں نے کہا اب جو منصب تم چاہو تمھیں مل سکتا ہے اور اس موقع سے تمھیں فائدہ اٹھانا چاہیے، آزاد نے جواب دیا "آزاد شدہ ام بندۂ مخلوق نمی توانم شد" اور یہ شعر پڑھا:-

دریں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند | غنیمت ست کہ ما را ہمیں بما بخشند[3]

صاحب تذکرۂ بے نظیر لکھتے ہیں کہ والہ لاہوری نے آزاد کو "نوکر پادشاہی" لکھا ہے، جو

[1] آزاد: سرو آزاد ص ۱۹۱ [2] سراج الدین علی خان آرزو: مجمع النفائس [3] آزاد: مآثر الکرام ص ۱۶۳

غلط ہے، آزاد نے کبھی کسی بادشاہ یا امیر کی ملازمت نہیں کی،[1] صاحب تذکرۂ بے نظیر کی وارستہ پر خفگی بے جا ہے، آزاد اپنی بے نیازی و استغنا کے باوجود بہر حال نواب نظام الدولہ و نواب صمصام الدولہ وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہتے تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، اس لیے وارستہ کے بیان کو کلیتہً غلط نہیں کہا جا سکتا۔

آزاد نے جس طرح ارباب اقتدار و ثروت سے جلب منفعت کا خیال نہیں کیا اور انکی دولت سے بے نیاز رہے اسی طرح اپنے اثر و رسوخ پر نازاں نہ ہوئے، صاحب مردم دیدہ کے قول کے مطابق ان کی زندگی فقیرانہ شان سے گذری، ان میں غرور بالکل نہ تھا، لوگوں سے خلق و تواضع اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور غریبوں اور فقیروں کو اپنے فیض و کرم اور اخلاق عمیم سے ممنون اور خوش رکھتے،[2] ان کا یہ قول تھا کہ جو اس عالم میں سب سے کم درجہ کا ہے، اس عالم میں سب سے اونچا درجہ رکھے گا اور حسن تعلیل کے طور پر فرماتے کہ کتاب (قلمی) کا آخری لفظ اگر ایک صفحہ پر سب سے مؤخر ہوتا ہے تو دوسرے صفحہ پر سب سے مقدم، اسی خیال کا اظہار انھوں نے ایک شعر میں بھی کیا ہے:

سرفراز آں جہاں باشد ذلیل این جہاں
حرف ختم صفحہ تاج صفحۂ آئندہ است[3]

اگرچہ آزاد نے امرا و ارباب اختیار سے تعلقات کا فائدہ اپنی ذات کے لیے نہیں اٹھایا لیکن اپنے اثر و رسوخ سے دوسروں کو فیض پہنچانے سے دریغ نہیں کیا، شفیق نے ان کی ہمدردی و فیض رسانی کا ذکر ان مبالغہ آمیز الفاظ میں کیا ہے:-

"انجاح حوائج عالم و فیض رسانی و دلسوزی خلق و کلمۃ الخیر و دستگیری غربا، و حفظ الغیب ہر کدام کہ در مزاج اقدس یافتہ می شود از سلف و خلف دیدہ و شنیدہ نشد۔"[4]

[1] انتخاب، دولت آبادی: تذکرۂ بے نظیر [2] عالم لاہوری: مردم دیدہ (لاہور ۱۹۶۱ء) ص ۳۵ [3] شفیق: گل رعنا [4] ایضاً

آزاد کے ایک شاگرد ضیا برہانپوری نے انکی مدح میں ایک مثنوی لکھی تھی، اس میں ان کی فیض رسانی اور خاص و عام کے ساتھ عملی ہمدردی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

بہر حصول غرض خاص و عام
ہست زبانش متحرک دوام

ہمت عالیش سحاب ست و بس
رشحہ نشاں برگل و بر خار و خس

فیض رسانی عمل خاص او
جملہ جہاں بندۂ اخلاص او

بس کہ بامداد کمر بستہ است
خانۂ او دامن ہر خستہ است[1]

خود آزاد نے اپنے جذبۂ خدمت خلق اور عملی ہمدردی کی توفیق پر جو خدا نے انھیں دی تھی حیرت اور طمانیت کا اظہار کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

"مدار نیت این خادم الخلائق بر آنست کہ اگر دست کوتاہ را قدرت رسائی نیست باری قدم طریق اعانت محتاجان بپیماید و اگر انگشت ناتوان را طاقت گرہ کشائی نیست بہر حال قلم بسفارش مستمندان زبان کشاید۔"[2]

شفیق کا بیان ہے کہ آزاد کے سفارشی خطوط اکسیر کا حکم رکھتے تھے،[3] اور خود آزاد کی زبان سے سنا ہوا مندرجۂ ذیل واقعہ اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے:

"جب نظام الدولہ ارکاٹ تشریف لے گئے اور مظفر جنگ پر فتح پائی تو وہاں کے عمال کو حضور میں طلب کیا گیا، نواب صمصام الدولہ کے دروازہ پر خیمہ نصب کیا گیا اور اس میں ان لوگوں کو ٹھہرایا گیا، ایک دن میں نواب صمصام الدولہ کے خیمہ سے باہر نکلا تو ایک شخص دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حاجی عبدالشکور عامل معزول کہتے ہیں کہ میں تہراولون کے اختیار میں ہوں اور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا، آپ تکلیف کر کے یہاں تشریف لے آئیں،

[1] اسد علی خان تمنا اورنگ آبادی: گل عجائب (اورنگ آباد ۱۹۳۶ء) ص ۶۵ [2] آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۱۴۹ [3] شفیق: گل رعنا

اگرچہ میں عامل مذکور سے واقف نہ تھا لیکن ان کے پاس نہ جانا شیوۂ مروت کے خلاف سمجھا، چنانچہ میں ان کے پاس گیا، انھوں نے مجھ سے محاسبہ اور قید کی شکایت کی، میں اسی وقت نواب صمصام الدولہ کے پاس دوبارہ گیا، اور ان سے کہا کہ حاجی عبدالشکور نام کے ایک عامل آپکے دروازہ پر ہیں، انھیں حاضر ہونے کا موقع دیجیے، نواب نے کہا کہ عامل محاسبہ دار کو روبرو آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، میں نے کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ انھیں محاسبہ سے درگذر کیا جائے، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انھیں ایک بار آپ کے روبرو آنے کی اجازت مل جائے، نواب کی طرف سے انکار تھا اور میری طرف سے اصرار، آخر نواب نے انھیں روبرو آنے کی اجازت دی، جب ان پر نگاہ پڑی تو ان سے بڑی شفقت سے پیش آئے اور کہا کہ کل نواب نظام الدولہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو جائیں، اور ایک چوبدار کو تاکید کی کہ فلاں شخص جب آئے تو فوراً ہم کو اطلاع دیجائے، دوسرے دن حاجی عبدالشکور ڈیوڑھی پر حاضر ہوئے اور چوبدار نے اطلاع دی، نواب صمصام الدولہ نے نواب نظام الدولہ سے عرض کی کہ حاجی عبدالشکور نام کے ایک عامل محاسبہ دار عمال میں شامل ہیں، میر غلام علی نے مجھ سے سفارش کی کہ ایک بار انھیں آپ کے روبرو پیش ہونے کا موقع دیا جائے، میں نے بہت انکار کیا لیکن ان کا اصرار جاری رہا، مجبوراً میں نے انھیں روبرو بلا لیا، اب وہی غرض آپ سے میری ہے، ایک بار ان کو اپنے روبرو حاضر ہونے کا موقع دیجیے، نواب نظام الدولہ نے حاضر ہونے کی اجازت دی، وہ اندر داخل ہوئے اور نواب کی نگاہ ان پر پڑی تو انھوں نے دیکھا کہ نوے سال کا ایک پیر مرد پھٹی پرانی کرتہ پہنے پگڑی باندھے، ہاتھ میں عصا اور تسبیح لیے "صورت ولایت" اور "عکس ترحم" کھڑا ہے۔ نواب نظام الدولہ نے انھیں اپنے قریب بلایا اور بٹھا لیا، ان سے باتیں کیں اور ان کی

فرد محاسبہ پر (قریب بیس ہزار روپے) معافی نامہ لکھ دیا، ان کا یومیہ مقرر کیا اور اپنی سرکار سے انھیں سواری دے کر رخصت کیا"[1]

شفیق لکھتے ہیں کہ ایک دن آزاد مولوی قمرالدین اورنگ آبادی کے پاس بیٹھے تھے، ایک شخص مولوی صاحب کے لیے ایک کتاب ہدیۃً لایا، اس شخص کی حقیقت میں ایک غرض تھی، وہ ناظم شہر کے نام مولوی صاحب سے ایک سفارشی خط چاہتا تھا، مولوی صاحب نے کتاب کو "وجہ رشوت" قرار دیکر لینے سے انکار کر دیا، آزاد نے اس شخص سے کہا کہ تم یہ کتاب ہدیۃً مجھے دیدو، اس نے دے دی، آزاد نے وہ کتاب مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ اب یہ کتاب میری ہے اور اسے میں آپ کو دے رہا ہوں، اب شائبۂ رشوت باقی نہیں رہا، مولوی صاحب مسکرائے اور کتاب لے لی، حاضرین مجلس بھی بہت شگفتہ ہوئے[2]۔

اس فیض رسانی اور دلسوزی کے ساتھ ساتھ ان میں یہ خوبی بھی تھی کہ نہایت صلح کل اور مرنجاں مرنج انسان تھے، طبیعت میں ضبط و تحمل تھا، اگر کوئی ناگوار بات سنتے تو اسے پی جاتے، ان کا عمل وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا پر تھا، فرمایا کرتے تھے کہ اندمال زخم ہنر ہے اور انقطاع بے ہنری، دانشمند کو چاہیے کہ عمارت کو گرنے سے بچائے، ڈھانے کا کام تو ایک بچہ بھی کر سکتا ہے، اسی افتاد طبیعت کا نتیجہ تھا کہ وہ کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے اور بدی کے بدلے میں بھلائی کرتے تھے، ان کا قول تھا کہ سب سے بڑا انتقام یہ ہے کہ مخالف تم سے التجا کرنے پر مجبور ہو جائے، ایک شعر میں فرماتے ہیں:

آزاد من بدشمن خود بد نمی کنم ‌ ‌ ‌ نامنصف ست ہر کہ دغا می دہد ہرا[3]

ان کی اسی صلح پسند اور انسان دوست طبیعت کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی دو آدمیوں میں تلخی

---

[1] شفیق: گل رعنا [2] ایضاً [3] ایضاً

شکر رنجی یا کشیدگی پیدا ہو جاتی تو وہ اپنے حسن تدبیر سے ان کی کشیدگی کو دور کر دیتے، نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں آزاد کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

"بر رشتۂ دوستی اگر پیچ عجب افتادہ بود، بناخن تدبیر شما واشد"[1]

شفیق نے اپنے تذکرہ میں دو واقعے ذکر کیے ہیں، جن سے آزاد کی صلح جوئی اور حسن معاملہ کا اندازہ ہوتا ہے، ایک واقعہ یہ ہے کہ

"ایک دن سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین میں نغمہ و سرود کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی، سید صاحب جائز کہتے تھے اور مولوی صاحب مخالف تھے، حاجی حسام الدین نام کے ایک شخص جو صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ بڑے سیاح بھی تھے، اس مجلس میں موجود تھے، وہ سید صاحب کے طرفدار ہو گئے، مباحثہ نے طول کھینچا، آخر آزاد نے ایک تدبیر سوچی، انھوں نے حاجی صاحب سے کہا کہ آپ نے تو سیاحت بہت کی ہے، یہ بتائیے کہ حضرت ہودؑ کی قبر کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا، یمن میں، آزاد نے کہا جی نہیں، شام میں ہے، حاجی صاحب نے پھر کہا یمن میں ہے، میں نے اس قبر کی زیارت کی ہے، آزاد نے کہا میں نے ایک نہایت معتبر کتاب میں پڑھا ہے کہ شام میں ہے، کچھ دیر تک دونوں میں بحث ہوتی رہی، سید غلام حسن اور مولوی فخر الدین اپنی بحث کو بھول کر اس بحث کی طرف متوجہ ہو گئے، جب آزاد نے دیکھا کہ مناقشۂ نغمہ تمام ہو چکا ہے تو حاجی صاحب سے کہا کہ آپ صحیح فرما رہے ہیں، حضرت ہود کی قبر یمن میں ہے"[2]

آزاد نے اس حکمت عملی سے دو مولویوں کے جھگڑے کو ختم کر دیا، دوسرا واقعہ یہ ہے:

"ایک رات حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے عرس کی تقریب کے سلسلہ میں

[1] شاہ نواز خاں: منشآت شاہ نواز خاں [2] شفیق: گل رعنا۔

سید غلام حسن کے مکان پر اعیان شہر جمع تھے، شاہ محمود تشریف لائے تو سید غلام حسن کشیدگی کی وجہ سے ان کی تعظیم کے لیے کھڑے نہیں ہوئے، شاہ محمود کو یہ بات ناگوار گذری، وہ کبیدہ خاطر ہوئے، سید صاحب نے بھی خاموشی اختیار کی، بڑی دیر تک مجلس میں سناٹا چھایا رہا، آزاد اس خیال سے کہ دونوں بزرگوں میں مصالحت کرا دیں، ان کے قریب آکر بیٹھے، اس دن سید صاحب نے ہزارہ پہن رکھا تھا، ہزارہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا ہر بوٹا مختلف انداز کا ہوتا ہے، آزاد نے دونوں حضرات کو مخاطب کر کے کہا کہ اس کپڑے سے سلوک کے ایک مسئلہ کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ تجلی حق کی تکرار نہیں ہوتی، یہ بات سن کر دونوں بزرگ مسکرا پڑے، ان کا انقباض انبساط میں تبدیل ہو گیا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے"[1]

آزاد نے اپنے بعض اشعار میں بھی اپنی اس افتادِ طبع کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً

ہمچو گل رنگیں لباسِ صلحِ کل پوشیدہ ایم ۔۔۔ تار و پود شعلہ و آب است در دامانِ ما

در وسعتِ مشرب نتواں یافت بجز صلح ۔۔۔ آئین تنازع روش سنی و شیعی است

آزاد کی اسی صلح جو و امن پسند فطرت کا نتیجہ تھا کہ ان کے مزاج میں شگفتگی اور طبیعت میں لطافت و بذلہ سنجی تھی، اور بقول شفیق ان کے وجود سے مجلس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، وہ خود فرماتے ہیں:

ساقیا آزاد ما را ہر کجا باشد بخواں ۔۔۔ بی حضور او سروری نیست در میخانہ ما[2]

شفیق نے اپنے تذکرہ میں ان کے بہت سے لطیفے لکھے ہیں، ان میں سے دو ایک کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا، لطیفوں کے نقل کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے اکثر و بیشتر لطیفوں سے محض خوش طبعی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ ان سے اعلیٰ درجہ کی ظرافت

[1] شفیق: گل رعنا [2] ایضاً

اور نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے، مثلاً

"جس زمانہ میں آزاد تکیۂ شاہ محمود میں قیام فرما تھے، ایک مغل بخارا سے آیا، اسے آزاد کے پہلو والے کمرے میں ٹھہرایا گیا، صبح کو وہ آزاد کے کمرے میں آیا اور نہایت بے تکلفانہ انداز سے کہنے لگا کہ میں تازہ وارد مہمان ہوں، آپ نے میری دعوت نہیں کی، آزاد نے برجستہ جواب دیا، اتنی قدیم آشنائی کے باوجود آپ میرے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے۔"[1]

"ایک دن آزاد نواب آصف جاہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک ہندو مسلمان ہونے کے ارادہ سے آیا اور مشرف باسلام ہوا، عرض بیگی نے عرض کی کہ وہ نام کا امیدوار ہے، نواب نے آزاد سے کہا کوئی ایسا نام تجویز کرو جو مشعر دین اسلام ہو، آزاد نے کہا دین محمد، نواب نے کہا کہ ابھی کل ہی ایک ہندو مسلمان ہوا اور اس کا نام دین محمد رکھا گیا، آزاد نے برجستہ کہا کہ دین محمد جس قدر زیادہ پھیلے بہتر ہے، اللھم انصر من نصر دین محمد۔ نواب بہت خوش ہوئے اور یہی نام رکھا گیا۔"[2]

"فرماتے تھے کہ سفر میسور میں ایک دن میں اور نواب نظام الدولہ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے، ہمارا گذر ایک ہموار صحرا سے ہوا، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سوار اور پیادے ہی نظر آرہے تھے، نواب نے مجھ سے کہا کہ لشکر کا یہ منظر دیکھنے کے لائق ہے، میں نے کہا کہ مسئلۂ جبر و اختیار جو مشکل ترین مسئلہ ہے یہاں حل ہوتا ہے، ان تمام سپاہیوں کے حرکات ایک شخص کے تابع ہیں اور وہ اس کے ارادہ (حکم) سے حرکت کرتے ہیں۔"[3]

"ارکاٹ کے دوران قیام کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک ہرن نواب نظام الدولہ

[1] شفیق: گل رعنا [2] ایضاً [3] ایضاً۔

کے خیمہ کے پاس لاکر بٹھایا گیا، نواب نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے کہا: کیا رائے ہے اسے ذبح کیا جائے یا آزاد کر دیا جائے؟ چونکہ نواب کو ہرن کے شکار کا بہت شوق تھا، حاضرین مجلس نے کہا کہ ذبح کرنا چاہیے، نواب نے آزاد سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مجھے ایک قصہ یاد آگیا، اگر حکم ہو تو سناؤں، نواب نے کہا سنائیے، آزاد نے کہا کہ ایک بادشاہ نے ایک قیدی کے قتل کا حکم دیا، ضابطہ کے مطابق قتل کرنے سے پہلے اس شخص سے پوچھا گیا کہ تمھاری کوئی خواہش ہے؟ اس نے کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ قتل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے بادشاہ کی مجلس میں مجھے باریابی نصیب ہو، بادشاہ کو اسکی اطلاع دی گئی تو اس نے حکم دیا کہ اسے دربار میں لے آیا جائے، لانے کے بعد اس سے پوچھا گیا کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کچھ نہیں، جب بادشاہ اٹھنے لگا تو قیدی نے کہا، بادشاہ سلامت میں قصور وار اور قتل کا مستحق ہوں لیکن چند لمحے میں نے آپ کی صحبت میں گذارے ہیں، اس طرح آپ پر میرا حق صحبت ثابت ہوتا ہے، بادشاہ اس حسن ادا سے بہت خوش ہوا اور اسے معاف کر دیا، یہ قصہ سنانے کے بعد آزاد نے کہا یہ ہرن بھی آپ کی صحبت میں بیٹھ چکا ہے، آگے آپ کی مرضی، نواب مسکرائے اور ہرن کو آزاد نام دے کر آزاد کر دیا۔"[1]

"ایک رات کو نواب نظام الدولہ نے چند سادات عرب کی دعوت کی، کھانے کے بعد قہوہ کا دور چل رہا تھا، نواب کو قہوہ بہت پسند تھا، مدینہ منورہ کے ایک سید صاحب نے خالی الذہن ہو کر کہا کہ **القھوۃ محرمۃ عند بعض العلماء**۔ نواب نے آزاد کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کا اس مسئلہ کے متعلق کیا خیال ہے؟ آزاد نے

[1] شفیق: گل رعنا۔

تنظیم من دو بالا گوہر غلطانم از ابتذال مصئون وبلال ناتوانم قدر من روز افزون

امید وارم کہ در نشاۃ آخری ہم بقرب باطعزت مسرور شوم[1]"

شفیق نے اپنے تذکرہ میں مندرجہ ذیل واقعہ لکھا ہے، جس سے آزاد کے رکھ رکھاؤ اور تمکنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک بار اورنگ آباد میں آزاد کی ایک شال چوری ہوگئی، چند دنوں کے بعد ان کے ایک دوست نے بازار میں دیکھا کہ ایک آدمی اسے بیچ رہا ہے، انھوں نے وہ شال خریدنے کے بہانے سے اس سے لے لی اور لاکر آزاد کو دکھائی، اور کہا کہ اس آدمی سے مواخذہ ہونا چاہیے کہ یہ شال اسے کہاں ملی، آزاد نے کہا کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ ایک چھوٹے آدمی کے سامنے عدالت میں کھڑا ہوں، شال لوٹا دی گئی۔[2]

اگرچہ آزاد میں استغناء اور بے نیازی تھی اور ان کی زندگی ایک حد تک درویشانہ تھی لیکن رسم و رہِ خانقہی کے ساتھ ساتھ وہ راہ و رسم دنیا سے بھی خوب واقف تھے، ان کے شاگرد و مداح شفیق کا بیان ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی خواہ دنیا دار ہو یا فقیر، جس شہر میں رہے اسکے حاکم سے راہ و رسم رکھے، کیونکہ کاموں میں اکثر حاکم کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، بلکہ بعض اوقات کوئی ایسی بلائے ناگہانی نازل ہو جاتی ہے جو حاکم کی مدد کے بغیر رفع نہیں ہوسکتی۔[3]

آزاد کے حالات زندگی ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کا یہ قول محض نظریہ کی حد تک نہ تھا، بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا، نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کے خطوط جو انھوں نے آزاد کے نام لکھے ہیں، اس کے شاہد ہیں کہ آزاد کو دکن کے سیاسی حالات سے بھی عملی دلچسپی تھی، اور نواب نظام الدولہ نواب صمصام الدولہ وغیرہ معاملات ملکی میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے، ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۵ء میں جب

[1] آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۴۸ [2] شفیق: گل رعنا [3] ایضاً

کہا کہ مولانا کا مفہوم ہے کہ قہوہ بعض علماء کے نزدیک منظم ہے، کیونکہ محترم کا مادہ احترام ہے، نواب چپ ہوگئے اور سید صاحب بھی بات کو پا گئے، جب مجلس برخاست ہوئی تو انھوں نے آزاد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے میرے قول کی نہایت عمدہ توجیہ کی۔"[1]

"ایک رات آزاد کو ایک مجلس میں ساری رات بیٹھنے کا اتفاق ہوا، تو انھوں نے کہا کہ اگر بیٹھے بیٹھے انسان کو تھوڑی دیر کے لیے غنودگی آجائے تو نیند کا خمار جاتا رہتا ہے اور راحت محسوس ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ روح ہمیشہ مبدأ فیاض کی مشتاق رہتی ہے، بیداری اسے عالم ارواح سے دور رکھتی ہے، اور نیند نزدیک پہنچاتی ہے، کیونکہ نیند کی حالت میں اس عالم سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور وہ روحانی دنیا میں پہنچ جاتی ہے، حالت بیداری میں اسے عالم ارواح سے مفارقت رہتی ہے اس لیے اس پر ملال طاری رہتا ہے اور نیند کی حالت میں اسے تھوڑی سی قربت حاصل ہوتی ہے، اس لیے تسلی ملتی یا انبساطی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ کلفت سے راحت کو بدل دیتی ہے۔"[2]

ان لطائف سے آزاد کی شگفتگی طبع، بذلہ سنجی، حاضر دماغی اور نکتہ آفرینی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، لیکن شفیق ہی کا بیان ہے کہ ان کی بزم میں ہزل کا گذر نہ تھا، ان کے قلم یا زبان سے کبھی "لچر اور مبتذل لفظ سننے میں نہیں آیا، خود فرماتے ہیں:

ز حرفِ تلخ مبراست خامۂ آزاد | کہ زہر ریختن از نیشکر نمی آید[3]

اسی طرح آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں کہ

"از خواص من است کہ با وصف گرمیِ اختلاطی تکریم من بجاست و با وجود سیر امتزاجی

[1] آزاد: سرو آزاد ص ۱۹۱ [2] شفیق: گل رعنا [3] ایضاً

صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کو ان کے عہدہ سے معزول کر دیا گیا تو آزاد ہی تھے جنھوں نے شاہنواز کی وکالت کی اور آخر کار وہ اپنے عہدہ پر بحال ہوئے۔[1]

مندرجۂ ذیل واقعہ سے آزاد کی عاقبت بینی اور دور اندیشی کا پورا اندازہ ہوتا ہے:

اوپر ان کے سفرِ ارکاٹ کا ذکر آچکا ہے، ایک دن وہ خیمہ میں چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک درویش شاہ جمیل ان کے پاس آئے، آزاد ان کی تعظیم میں سرو قد کھڑے ہو گئے اور ان سے خوش اخلاقی سے باتیں کیں، جب وہ چلے گئے تو حاضرین مجلس نے کہا کہ آپ نے بھی کس کی تعظیم کی، یہ تو فلاں شخص کا باورچی ہے، آزاد نے جواب دیا، میں نے لباس فقر کی تعظیم کی، شاہ جمیل کی آمد و رفت کا سلسلہ جب تک جاری رہا، آزاد نے اسی طرح ان کی تعظیم کی جیسے پہلے دن کی تھی، اتفاق سے نواب نظام الدولہ، ہمت خاں کے ہاتھوں قتل ہوئے، اس کے بعد شاہ جمیل آزاد سے ملنے آئے اور اپنے ساتھ ہمت خاں کے مدار المہام امانت اللہ خاں کو بھی ساتھ لائے، امانت اللہ خاں نے پچاس ہون طلائی مسکوک دکنی ان کی خدمت میں پیش کیے اور کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمت خاں کی ذات سے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔[2]

شفیق کا بیان ہے کہ جن دنوں نواب نظام الدولہ، مظفر جنگ سے جسے فرانسیسیوں نے کمک دی تھی، نبرد آزما تھے، ایک روز آزاد نے نماز مغرب میں سورۂ اذا جاء نصر اللہ والفتح کی تلاوت کی، شمر کاسے نماز بہت خوش ہوئے اور آزاد سے کہا کہ آپ نے یہ سورہ بہت موقع سے پڑھی، انشاء اللہ ہماری فتح ہوگی اور فوج نصاریٰ یدخلون فی دین اللہ افواجا کے قول کے مطابق مطیع ہو جائے گی، آزاد نے کہا کہ میں نے یہ سورہ بالقصد فال لینے کے ارادہ سے پڑھی ہے، دوسرے روز نواب نظام الدولہ کی فتح کا اعلان ہوا، اور آزاد کی فال نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی۔[3]

---

[1] شاہ نواز خاں: مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰، ۲۹ [2] شفیق: گل رعنا [3] ایضاً

شفیق ہی کا بیان ہے کہ اگرچہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں پر فتح پائی، لیکن آزاد کی دور بیں نگاہ چھ سال پیشتر اس فتح کا منظر دیکھ رہی تھی، اس فتح کا ان کو اتنا یقین تھا کہ انھوں نے ایک قطعہ احمد شاہ کی آمد اور مرہٹوں کی ہزیمت سے متعلق اس انداز سے لکھا گویا یہ واقعہ عالم رویا میں متعین ہو چکا ہے، وہ قطعہ مندرجۂ ذیل ہے:-

شاہی رسید و ہند سیہ فام را گرفت ماہی طلوع کرد و سرِ شام را گرفت
چوں ریش خویش شد علف تیغ بی دریغ آں برہمن کہ سلطنتِ عام را گرفت
شکر خدا ......[1] تصحیح حک نمود نقش غلط کہ صفحۂ ایام را گرفت
آخر ز تیغ خسرو غازی بریدہ شد زلف ایاز گرد دل خود کام را گرفت
انجام کارِ غیر ندامت چہ صرفہ بود فیلی کہ راہ خانۂ احرام را گرفت
نازم با قتدارِ سلیمانِ کامگار از دست دیو کشور اسلام را گرفت
آمد خبر ز دہلی محروس در دکن آزاد با بمی کدہ گل جام را گرفت[2]

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ آزاد شاہ لدھا بلگرامی کے مرید تھے، شاہ لدھا کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے تھا، اس لیے آزاد طریقۂ چشتی اور وحدت وجود کے قائل تھے، شفیق کا بیان ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ اس دنیا سے نہیں لیکن اس کے ہر جزء میں موجود ہے، اور اس کی مثال یہ دیتے تھے کہ علمائے حساب کی رائے میں واحد کا شمار اعداد میں نہیں مگر وہ ہر عدد میں موجود ہے۔ اس مضمون کو انھوں نے مندرجۂ ذیل رباعی میں بھی ادا کیا ہے:-

---

[1] لفظ پڑھا نہیں گیا [2] شفیق: گل رعنا

اللہ بدون ز عالم ایجاد است | لابد آں جملۂ افراد است
شک نیست کہ واحد نبود از اعداد | لیکن موجود در ہمہ اعداد است[1]

عبدالوہاب افتخار دولت آبادی جو آزاد کے شاگرد تھے، کہتے ہیں کہ آزاد درویشی و سخن طرازی میں امیر حسن کے مانند تھے، اور طرفہ یہ کہ امیر حسن بھی دکن گئے تھے، چنانچہ آزاد کہتے ہیں:

ز ہند آمد ، بانفرو شاعری بدکن | عجب تشابہ آزاد با حسن باشد[2]

صاحب گل عجائب بھی آزاد کے شاگرد تھے، وہ اپنے استاد کی مدح میں کہتے ہیں کہ "خامۂ شناگذار در تحریر فضائلش الکن و نامۂ اوصافِ آثار در احصائے حسن خصائل خاق الفضا ءبما الکن[3]"۔

---

[1] شفیق : گل رعنا [2] افتخار دولت آبادی : تذکرۂ بے نظیر [3] تمنا اورنگ آبادی : گل عجائب۔

مقالات شبلی

(حصہ پنجم)

یہ مولانا شبلی کے اُن مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام و مشاہیر علم و فن کے سوانح و حالات و کمالات سے متعلق ہیں، اس میں ابن رشد، علامہ ابن تیمیہ حرانی، متنبی، زیب النسا بنت اورنگ زیب عالمگیر اور مولوی غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ جیسے مشاہیر تاریخ اسلام پر مولانا کے اہم اور مفید مضامین ہیں۔

ضخامت ۱۳۶ صفحے   قیمت :- ۶؍

منیجر

نارجیل سے نخیل تک

از

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ملک عرب کے اطراف و جوانب میں غیر ملکیوں کی بہت زیادہ آبادی تھی، اور جب اسلام کی دعوت جزیرۃ العرب میں پھیلی تو عربوں کی طرح وہاں پر آباد دوسری قوموں کو بھی اس سے واسطہ پڑا، اور عربوں کی طرح عام طور سے وہ بھی مسلمان ہو گئیں، یا ان میں سے کچھ لوگوں نے جزیہ دے کر اپنے دین پر قائم رہنا پسند کیا،

شمال مغرب میں شام سے متصل عربی علاقہ رومیوں کے قبضہ میں تھا، اور وہاں رومیوں کی طرف سے عرب حکمراں انتدابی قسم کی حکومت کرتے تھے، جیسے شام کے غساسنہ اور حیرہ کے مناذرہ، شمال مشرق میں عراق پر شاہان ایران کا قبضہ تھا، جن کا مرکز اُبلہ تھا، اور خلیج عربی کے پورے سواحل، بحرین، عمان پر ان کے اساورہ یا ان کے ماتحت عرب حکمراں حکومت کرتے تھے، یہ سلسلہ یمن تک قائم تھا، اور مشرقی عرب کا پورا ساحلی علاقہ ایرانیوں کے قبضہ میں تھا، پھر یمن سے مغرب کے علاقوں میں حبشہ اور زنج کثیر تعداد میں موجود تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد طفولیت میں یمن کے عرب حکمراں سیف بن ذی یزن کو حبشہ کے بادشاہ نے مغلوب کر کے پورے یمن پر قبضہ کر لیا تھا، مگر اس کے فوراً بعد ہی وہاں پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا، جو بعثت کے وقت تک قائم رہا، الغرض عرب کے حدود پر غیر ملکی قابض و دخیل تھے، اور

ان کے آدمی یا ان کے نمائندے حکمرانی کرتے تھے، اس طرح بعثت نبوی کے وقت عرب میں رومی، ایرانی، حبشی اور ہندی اپنے اپنے اثر و اقتدار کے ساتھ موجود تھے،

ہندوستان کی قومیں اگرچہ عرب میں براہ راست اپنا اثر و اقتدار نہیں رکھتی تھیں مگر مختلف وجوہ سے ان کی حیثیت بلند تھی جس میں بڑا دخل ایرانیوں کے عرب پر قبضہ کو تھا، ایرانی ایک طرف ہندوستان اور سندھ و بلوچستان کے راجوں، مہاراجوں اور یہاں کے لوگوں کو اپنے اثر و اقتدار میں رکھتے تھے اور دوسری طرف عرب کے ساحلی علاقہ میں عراق سے لیکر یمن تک حاکمانہ طاقت رکھتے تھے، اس لیے ہندوستانیوں کو عرب کے ان حدود میں ایرانیوں کے توسط سے اقتدار نصیب ہوا، اور ایران کی فوج اساورہ میں ہندوستان کے بہت سے آدمی شامل ہوکر عرب میں رہنے لگے، ہندوستان اور عرب کے قدیم ترین تجارتی تعلقات کے بعد ایران کے توسط سے اس حاکمانہ تعلق نے ان میں عرب سے مزید دلچسپی پیدا کی اور یہاں کے لوگ ہندوستانی اشیاء کی تجارت، عرب کے جہازوں اور کشتیوں پر ملازمت اور عرب میں آباد ہوکر وہاں کے اقامت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے، جس کے نتیجہ میں عہد رسالت میں عرب کے اندر ہندوستانیوں کی مختلف قومیں اور جماعتیں رہنے لگیں، جن کو عرب کے باشندے اپنی زبان میں مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے، چنانچہ عربوں نے اپنے ملک میں آباد ہندوستانیوں کو زط، اساورہ، سیابجہ، احامرہ، میدہ، بیاسرہ اور تکاکرہ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا، کسی ملک کے آدمیوں کو اتنے زیادہ نام و لقب سے یاد کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ وہاں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ ہر طرف مشہور تھے، اور چونکہ عربوں اور ہندوستانیوں میں بڑی حد تک مذہبی یکجہتی تھی اس لیے وہ بڑی آسانی سے عربوں کی زندگی میں مل جل گئے،

ان ہی حالات میں مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور چونکہ تیرہ سال تک کی زندگی مقامی کفار و مشرکین کی وجہ سے مظلومیت میں گذری اس لیے عرب کے انتہائی حدود کے

لوگوں کو اسلام سے کم واقفیت ہوئی، اور ان حدود کے عربوں کی طرح ہندوستانی بھی اسلام سے تفصیلی طور سے واقف نہیں ہوسکے، البتہ مکی زندگی میں حبشہ کی طرف صحابہؓ کی ہجرت ہوئی، اس لیے حبشہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو اسلام کی عام واقفیت ہوئی، اغلب یہ ہے کہ اسی سلسلہ میں حبشہ کے سامنے عرب سواحل کے عربی اور عجمی باشندوں کو بھی اسلام کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئی ہوں گی، چنانچہ حضرت باذانؓ حاکم یمن ابتدائے بعثت ہی میں اسلام لائے اور ان کے ساتھ یمن میں مقیم بہت سے اساورہ اور ایرانی نسل کے ابناء بھی مسلمان ہوئے، اس کے باوجود دعوت و تبلیغ کے طور پر ان اطراف میں اسلام کی تفصیلی معلومات نہیں ہوئیں، اور اس کا موقع اس وقت آیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے تیرہویں سال مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، ہجرت کے واقعہ نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق نہ صرف عرب کے انتہائی حدود میں تفصیلی واقفیت کے لیے راہ پیدا کی بلکہ اطراف و جوانب کے ان ممالک میں بھی اس کی خبر پہنچی جو عرب سے متصل تھے، اور ان ممالک سے عرب کے قدیم تعلقات تھے، اور جس طرح دوسرے ممالک میں یہ خبر پہنچیں، ہندوستان میں بھی ان کو سنا گیا، اور ایک گونہ دلچسپی ظاہر کی گئی،

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ اور سنہ نبوی کے درمیان حدود عرب میں دعوت اسلام بھیجی اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو اسلام کا مبلغ و داعی اور قاصد بنا کر عرب اور بیرون عرب کے رئیسوں، حاکموں اور باحیثیت لوگوں کو خطوط بھیجے تو اس وقت عراق سے لیکر مشرقی سواحل اور یمن تک میں اسلام کی دعوت عام ہوئی، اور ان اطراف کے عربوں کی طرح عجم، فرس اور مجوس وغیرہ بھی اس کی دعوت سے تفصیلی طور پر واقف ہوئے، ان ہی کے ساتھ یہاں کے ہندوستانی باشندے بھی عام طور پر اسلام سے باخبر ہوکر یا تو مسلمان ہوئے اور اسلامی زندگی کا جزو بن گئے یا عام مجوسیوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہ کر جزیہ ادا

کرنے پر راضی ہوگئے اور ان کو مجوس میں شمار کیا گیا،

نیز عہد رسالت میں جس طرح اسلام کا چرچا دیگر ممالک میں ہوا، ہندوستان میں بھی ہوا اور یہاں کے مذہبی لوگوں اور راجوں مہاراجوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی، اور دعوت اسلام کو سمجھنا چاہا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندوستان اور یہاں کے لوگوں کے متعلق باتیں کیں، قرآن حکیم میں ہندوستانی اشیاء کے نام آئے اور ان کا تذکرہ فرمایا گیا، احادیث میں ہندوستان کے باشندوں اور یہاں کی چیزوں کا تذکرہ آیا، یہاں کی بہت سی اچھی چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا اور صحابہ کو ان کے استعمال کا حکم دیا، بہت سی بری باتوں سے منع فرمایا، اور دور رسالت کی اسلامی ادبیات میں ہندوستان کی قوموں کے، یہاں کی چیزوں کے اور اس ملک کی باتوں کے تذکرے آئے۔ قرآن و حدیث کے علاوہ صحابہ کرام کے اشعار میں ان کا بیان ہوا،

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سیرت نبویؐ کے اس اہم پہلو پر کام کرنے کی توفیق اس ناکارہ کو ہوئی اور جب "سیرت نبویؐ اور ہندیات" کے موضوع پر احادیث و سیر اور تواریخ کا مطالعہ شروع کیا تو اس سلسلہ میں عجیب و غریب انکشافات سامنے آئے، اور سیرت نبویؐ کے بے پایاں دفتر پر اچھا خاصا حاشیہ تیار ہوگیا، یہ حسن اتفاق بھی ان شاء اللہ سعادتمندی کا باعث ہے کہ ہندوستان کے جس مردم خیز خطہ (اعظم گڈھ) میں سیرۃ النبی جیسی کامل و مکمل کتاب لکھی گئی، اسی خطہ کے ایک حصہ (مبارکپور) کے ایک ناکارہ کو اس پر یہ حاشیہ لکھنے کی توفیق ملی ہے،

شبلیؒ و سلیمانؒ کے موضوع پر قلم اٹھانا ایک گونہ جسارت کی بات ہے، مگر علم و تحقیق کے میدان میں اس طرح کی جسارت مفید ہوتی ہے، اس لیے جس سے جس قدر کام ہو سکے اس کے لیے کسر نفسی کو بہانہ بنا کر رک جانا مناسب نہیں ہے، اس سلسلہ میں ایک اہم کوشش کا ذکر ضروری ہے،

مورخ الہند علامہ میر غلام علی آزاد نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے "ودر اوقات نسخہ شمامۃ العنبر فیما ورد فی الہند من سید البشرؐ انداے نظر بساحل قرطاس رسید" (ماثر الکرام ج ۲ ص ۲۹۵)

افسوس ہے کہ صرف اس کتاب کا نام ہم تک پہنچ سکا ہے، اگر خود کتاب مل سکتی تو یقیناً اس سے بہت کچھ استفادہ ہو سکتا تھا،

سندھ اور ہندوستان عربوں کی نظر میں

سندھ اور ہند عربوں کے نزدیک دو الگ الگ ملک تھے، جو ان کے مشرق میں سمندر پار پڑتے تھے، سندھ کا ملک ہندوستان، کرمان اور سجستان وغیرہ کی حدود سے گھرا ہوا تھا، اس کے بعد ہندوستان کا ملک پڑتا تھا جو مشرق میں چین کی حدود سے ملتا تھا، اور دونوں ملکوں کو ملا کر ہند بھی بولتے تھے، جس طرح تاریخ نے اپنے کو دہرایا اور اب پھر ایک ملک ہندوستان کے تقریباً یہی دونوں علاقے بھارت اور پاکستان کے دو نام سے یاد کیے جانے لگے اور دونوں کے لیے جامع لفظ ہندوستان ہے،

قدیم ترین عرب جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ نے بلاد سندھ میں ان شہروں کو شمار کیا ہے:

قیقان (کیگان قلات) نبہ (غالباً بنون) مکران، مید، قندھار (گندھارا) قصدار، بوقان، قندابیل، فنزبور، ارمابیل، دیبل (قریب کراچی) قنبلی، کنبایا (کھنبایت) سہبان، سدوسان، راسک، الرور (الور) ساوندری، مولتان، سندان (سنجان بمبئی)، مندل، بیلمان (بھیلمان گجرات) سرست، کیرج، مرمد، قالی (پالی، جوناگڈھ) دھنج (گجرات) بروص (بھڑوچ)[1]

واضح رہے کہ ان شہروں کے ناموں میں ترتیب کا التزام نہیں ہے، بلکہ صرف ملک سندھ کے تمام شہروں کے نام دیے گئے ہیں، عام طور سے ان حدود کے باشندوں کو عرب سندھی سمجھتے اور کہتے تھے، سندھ شاہان فارس کے اثر و اقتدار کے ماتحت یوں رہا کرتا تھا کہ یہاں کے راجے مہاراجے

[1] المسالک والممالک ص ۵۷

ان کے باج گزار اور فرمانبردار ہوتے تھے، اور ضرورت کے وقت وہ یہاں سے فوج کے لیے آدمی بھی لیتے تھے، ایران کے بادشاہ اردشیر نے سندھ کے مہاراجوں کو اپنی طرف سے خاص خاص القاب سے بھی نوازا تھا چنانچہ اس نے قفص شاہ، مکران شاہ، قیقان شاہ، قشمیران شاہ سے سندھ کے ان مہاراجوں کو نوازا تھا جو یہاں حکمران تھے اور اس کے ماتحت تھے، اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے حلقہ میں ذاتی نام کے بجائے اپنے لقب سے مشہور تھا،[1]

عربوں کی تقسیم کی رو سے سندھ کے بعد ہندوستان کا ملک آتا تھا، جو حدود چین تک چلا گیا تھا، اور سندھ و ہند کے درمیان ساحل کی جانب قامہل نامی شہر تھا، یہ مقام غالباً بیکانیر، جیسلمیر یا جوناگڈھ کے اطراف میں کہیں تھا، جہاں سندھ اور ہندوستان کی سرحدیں ملتی تھیں، یاقوت حمویؒ نے لکھا ہے

قامُهُل مدينة في اول حدود	قامہل سندھ کے بعد ہندوستان کی شروع
الهند، ومن صيمور الى قامهل	سرحد میں واقع ہے، اور چیمور سے قامہل
من بلد الهند ومن قامهل	تک ہندوستان ہے، اور قامہل سے مکران
الى مكران، والبدهة وما	بدھ اور ملتان کی حد کے نیچے تک کا پورا
وراء ذلك الى حد الملتان	علاقہ سندھ میں شامل ہے، اور سندھ
كلها من بلاد السند	کے شہر منصورہ اور قامہل کے درمیان
وبين المنصورة وقامهل	آٹھ مرحلہ کا فاصلہ ہے، اور قامہل
ثمان مراحل ومن قامهل	سے کھمبایت تک تقریباً چار
الى كنباية نحو اربع مراحل[2]	مرحلے ہیں۔

قامہل اور چیمور (بمبئی) کے درمیانی علاقہ سے مراد گجرات ہے جسے یاقوت حموی نے ہندوستان

---

[1] المسالک والممالک ص ۱۸ [2] معجم البلدان ج ۷ ص ۸ طبع مصر

کا علاقہ بتایا ہے، اور اس سے آگے کے ساحلی علاقہ کو جس میں کوکن، ملیبار، میسور اور اس کے آگے کلہ، شلاہط (سلہٹ) تمار اور مملکت مہراج وغیرہ شامل ہیں، ان کو مراد نہیں لیا ہے،

ہندوستان کے سواحل اور ان کے اطراف و جوانب کے راجوں مہاراجوں کے القاب ابن خرداذبہ نے یہ بتائے ہیں: بلہرا، جابہ، طافن، ملک جزر، غابہ، رہمی، ملک قامرون، ملک ذرابج (ننجب) اور مہراج۔ فارس کے بادشاہ اردشیر نے ہندوستان کے مہاراجوں کو بھی اپنے لقب سے نوازا تھا، چنانچہ یہاں کے ایک راجہ کو ریحان شاہ کا لقب دیا تھا،[1]

دور رسالت میں عربوں کا تعلق سندھ اور ہند کے ان ساحلی علاقوں سے تھا اور عام طور سے ان مقامات پر آتے جاتے تھے، اور یہاں کی اشیاء و اشخاص و اقوام سے اچھی طرح واقف تھے، اور ان مقامات کے رہنے والے بھی ذاتی طور سے یا سن سنا کر عربوں سے واقف تھے۔

ہندستان اور عرب کے درمیان بحری اور ساحلی راستے

عرب کا ملک جنوبی ایشیا میں واقع ہے۔ شمال میں ملک شام، مشرق میں فرات اور بحر ہند کا ایک حصہ اور مغرب میں بحر احمر ہے، جبل سراۃ کا سلسلۂ کوہ یمن سے بادیۂ شام تک پورے ملک کو مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم کرتا ہے، مغربی حصہ میں جبل سراۃ سے بحر احمر کے ساحلی علاقہ کو غور کہتے ہیں، اور تہامہ، عبرہ، مشرقی عراق اور سماوہ کے علاقہ کو نجد کہتے ہیں، غور و نجد کے درمیان جو علاقہ حد فاصل کے طور پر واقع ہے، اسے حجاز کہتے ہیں، پھر نجد، مشرقی خلیج عربی، یمامہ، بحرین اور عمان کے علاقہ کو عروض کہتے ہیں، اور حجاز کے بعد جنوب تک کے علاقہ کو یمن کہتے ہیں،

ملک عرب کے عام باشندے دو طبقوں میں منقسم تھے، ایک اہل مدر اور دوسرے اہل وبر، اہل مدر وہ لوگ تھے جو آبادیوں میں رہتے تھے، ان کے پاس کھیتی باڑی، نخلستان، میوے، بھیڑ، بکری،

---

[1] المسالک والممالک ص ۱۶ و ۱۷

اونٹ، تجارت، غرض کہ کسب معیشت کے معقول ذرائع تھے، اور وہ اپنے دور کے تمدن کی زندگی بسر کرتے تھے، اور اہل دبر وہ لوگ تھے جو صحراؤں اور ریگستانوں میں بے گھر بار کی زندگی بسر کرتے تھے، ان خانہ بدوش لوگوں کا سہارا اونٹ تھا، یہ لوگ پورے سال پانی کے چشموں اور چارہ گھاس کی تلاش میں رہا کرتے تھے، گرمی کے ایام صحراؤں اور ریگستانوں میں اچھی طرح بسر کر لیتے تھے مگر جاڑے میں عراق اور شام کی حدود میں چلے جاتے تھے، یا دیگر بستیوں کے آس پاس جاکر بڑی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔[1]

ہندوستان کے جو لوگ اس زمانہ میں عرب میں رہتے تھے وہ عام طور سے بلاد و قریات میں رہنے والوں کے ساتھ رہتے تھے، اور ان کے ساتھ تجارت و ملازمت یا دوسرے کام کرتے تھے، البتہ خلیج عربی کے سواحل پر ہندوستانیوں کا ایک گروہ قدیم زمانہ سے خانہ بدوش عربوں کی طرح گھاس اور چارہ کی تلاش میں گھوم پھر کر زندگی بسر کرتا تھا،

عام طور سے ہندوستان کے باشندے عرب میں شمال مشرق سے لیکر جنوب تک کے سواحل اور ان کے اوپر کے شہروں میں رہتے تھے، ان علاقوں میں کئی عرب حکمراں بھی تھے، جو ایرانیوں کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے، جس طرح ہمارے زمانہ میں بھی ان علاقوں میں عرب شیوخ انگریزوں کی نگرانی میں حکومت کرتے ہیں اور معمولی معمولی امارتیں اور ریاستیں موجود ہیں،

اب ہم عرب سے ہندوستان آنے جانے کے ساحلی مقامات کی تفصیل بیان کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ پہلے زمانہ میں عرب و ہند کے درمیان بحری سفر کن راہوں سے ہوتا تھا، اس سلسلہ میں قدیم ترین عرب جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک کی تفصیلات زیادہ کارآمد ہیں، کیونکہ اس نے اپنا جغرافیہ قدیم معلومات کی بنیاد پر لکھا ہے، اور زیادہ اعتماد بطلیموس کے

[1] طبقات الامم ابن صاعد اندلسی ص ۵۹ مطبعۃ التقدم مصر۔

بیان کیا ہے جو یونان کا مشہور جغرافیہ نویس گذرا ہے، جیسا کہ ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کی تصریح کی ہے،

بصرہ (قدیم ابلہ) سے مشرق کی طرف فارس، ہندوستان اور چین تک کے بحری راستوں کی تفصیل یوں ہے: بصرہ سے جزیرۂ فارس پچاس فرسخ، یہ جزیرہ ایک فرسخ لمبا چوڑا ہے، یہاں پر انگور اور کھجور کے باغات ہیں اور کھیتی باڑی ہوتی ہے، یہاں سے جزیرہ لاوان اسی فرسخ ہے، یہ دو فرسخ کی لمبائی چوڑائی میں آباد ہے، یہاں کھجور کے باغات اور کھیت ہیں، یہاں سے جزیرہ ابرون سات فرسخ ہے، یہ ایک فرسخ میں آباد ہے، یہاں کھیت اور نخلستان ہیں، جزیرہ خین سات فرسخ ہے، یہ جزیرہ صرف نصف میل کا ہے اور غیر آباد ہے، یہاں سے جزیرہ کیس بھی سات فرسخ ہے، یہ چار فرسخ میں آباد ہے، یہاں کھیتی باڑی نخلستان اور مویشی کے علاوہ موتی بھی نکلتے ہیں، یہاں سے جزیرہ ابن کاوان اٹھارہ فرسخ ہے، یہ تین فرسخ میں آباد ہے، یہاں سے ارموز (ہرموز) سات فرسخ ہے، اور پھر تارا سات دن کی راہ پر ہے۔

بصرہ سے یہاں تک فارس اور سندھ کی درمیانی حد ہے، اور یہاں سے تیز دیبل (موجودہ کراچی کے آس پاس) آٹھ دن کی راہ پر ہے، جہاں سے مہران (دریائے سندھ) دو فرسخ پر سمندر میں گرتا ہے، اور مہران سے اوتکین چار دن کی مسافت پر ہے، یہ ہندوستان کا پہلا علاقہ ہے، یہاں سے مید دو فرسخ پر ہے، مید سے کولی بھی دو فرسخ ہے، پھر سندان (سنجان نواحی بمبئی) اٹھارہ فرسخ پر ہے، پھر ملی (ملیبار) پندرہ دن کی مسافت پر ہے، اسکے بعد بلین دو دن کی مسافت پر ہے، اور یہاں سے بحر اعظم بھی دو دن کی مسافت پر ہے، بلین سے سمندر میں کئی راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں، جو شخص ساحل سے چلے تو اس کے لیے بلین سے باتین دو دن کی مسافت ہے، وہاں سے سنجلی اور کبشکان ایک دن کی مسافت ہے، اور وہاں سے کودافرز کانگم تین فرسخ ہے، پھر اورنشین بارہ فرسخ ہے، اور وہاں سے ابینہ چار دن کی مسافت ہے،

اور جو شخص بلین سے سرندیپ جائے تو اس کے لیے ایک دن کی مسافت ہے، سرندیپ کے بعد جزیرہ رامی آتا ہے، اور جو شخص بلین سے چین جانا چاہے وہ بلین سے گھوم کر سرندیپ کو اپنے بائیں جانب کر دے

پھر سرندیپ سے جزیرہ النکبالوس دس سے پندرہ دن کی مسافت ہے، پھر جزیرہ کلہ چھ دن کی مسافت ہے، اس کے بائیں جانب جزیرہ بالوس بھی چھ دن کی مسافت ہے، اور وہاں سے جزیرہ جابہ، شلاہط، اور ہرلنج دو دو فرسخ ہیں، اس کے بعد پندرہ دن کی مسافت پر عطر کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔[۱]

مغرب سے مشرق آنے کا یہ بحری راستہ بصرہ (ابلہ) سے نکل کر فارس کے ساحلی مقامات سے ہوتا ہوا ہندوستان آتا ہے۔ ہندوستان کے لوگ قدیم زمانے میں اسی راستہ سے عام طور پر بصرہ تک آتے جاتے تھے، نیز عرب تاجر ان ہی راہوں سے گذر کر ہندوستان اور چین کا سفر کرتے تھے،

عمان سے لیکر بصرہ تک کا ساحلی علاقہ خلیج عرب (خلیج فارس) پر واقع ہے، اگر اس خلیج سے بصرہ سے مشرق کی طرف چلیں تو دایاں کنارہ عرب کا ہے، اور بایاں کنارہ فارس کا ہے، جو مشرق میں عرب کے علاقہ عمان اور فارس کے علاقہ بندرعباس تک ہو جاتا ہے، ابن خرداذبہ کے بیان کے مطابق اس خلیج کی چوڑائی ستر فرسخ ہے اور گہرائی ستر گز (باع) سے اسّی گز تک ہے، اور بصرہ سے عمان تک کا بحری راستہ یوں ہے، بصرہ سے عبادان تک دریائے دجلہ سے گذر کر بارہ فرسخ ہے، یہاں سے خشبات دو فرسخ ہے، پھر خشبات سے بحرین ستر فرسخ ہے، یہ شط العرب کا علاقہ ہے، پھر دُردُور ایک سو پچاس فرسخ ہے۔ اور یہاں سے عمان پچاس فرسخ ہے، عمان سے شحر دو سو فرسخ ہے، اور شحر سے عدن ایک سو فرسخ ہے، عدن بڑی عظیم الشان بندرگاہ ہے، یہاں نہ کھیتی باڑی ہے اور نہ مویشی ہیں، مگر عنبر، عود، مشک اور سندھ، ہندوستان، چین، زنج، حبشہ، فارس، بصرہ، جدہ اور قلزم کے تجارتی سامان بہت زیادہ رہتے ہیں،[۲]

یہ تو بصرہ سے عمان اور اس کے آگے ساحلی مقامات کے سمندری راستہ کی تفصیل ہے، ابن خرداذبہ نے بصرہ سے عمان تک کے ساحل اور خشکی کے راستہ کی بھی یوں تفصیل بیان کی ہے:

[۱] المسالک والممالک از صفحہ ۶۱ تا ۶۶ ملخص [۲] ایضاً ص ۶۰ و ۶۱

بقرہ، عبادان، حدوثہ، عرنجاء، ذابوتہ، المقر، عصٰی، معرس، نخلیجہ، حسان، القری، مسلیجہ، حمقی، ساحل ہجر، عقیر، قطر، السبخہ، عمان، عمان ہی میں صحار اور دبا شہر واقع ہیں۔[۱]

سواحل عرب کے قدیم بحری اور بری راستے

عرب اور ہندوستان کے قدیم تعلقات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود عرب کے بھی قدیم ساحلی حدود اور ان کی مسافتیں سمجھ لیں، تاکہ ذہن میں ان کا اجمالی نقشہ آجائے۔ ہم اسے قدیم عرب جغرافیہ نویس ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد فارسی اصطخری کی کتاب مسالک الممالک سے خلاصہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ملک عرب بحر فارس (بحر عرب) سے یوں گھرا ہوا ہے کہ عبادان سے بحرین ہوتا ہوا عمان تک چلا گیا ہے، پھر سواحل مہرہ، حضر موت اور عدن پر مڑتا ہوا سواحل یمن سے جدہ تک گیا ہے، پھر جار پر مڑ کر ایلہ پہنچا ہے، یہاں پر بحر فارس (بحر عرب) کی دیار عرب کی حد ختم ہو جاتی ہے، اور یہاں سے سمندر کی جو پٹی شروع ہوتی ہے اسے بحر قلزم (بحر احمر) کہتے ہیں، جو تاران اور جبیلات تک چلی جاتی ہے، یہ پورا علاقہ دیار عرب کا مشرقی جنوبی اور کچھ مغربی حصہ ہے۔ یہاں سے بحر قلزم ایلہ سے ہوتا ہوا قوم لوط کی بستی اور بحیرۂ منتنہ (بدبودار سمندر) سے گذر کر شراۃ اور بلقاء تک گیا ہے، یہ فلسطین کی بستیاں ہیں، پھر یہاں سے اذرعات، حوران، بثنیہ، غوطہ اور نواحی بعلبک سے گذرا ہے، یہ دمشق کا علاقہ، یہاں سے تدمر، سلمیہ سے گذرا ہے، جو حمص کی بستیاں ہیں، اور یہاں سے خناصرہ، بالس سے گذرا ہے، یہ سب قنسرین کے علاقے ہیں، یہاں آکر ہم دریائے فرات کے پاس آجاتے ہیں، یہ دریا دیار عرب کے علاقہ جات رقہ، قرقیسیا، رحبہ، والیہ، حدیثہ، ہیت اور انبار ہوتا ہوا کوفہ اور اس سے آگے اپنے سنگم تک چلا گیا ہے، پھر وہاں سے کوفہ اور حیرہ کے اطراف سے خورنق اور سواد کوفہ

[۱] المسالک والممالک ص ۶۰

ہو کر واسط کے حدود تک گیا ہے، جہاں سے دریائے دجلہ کا فاصلہ ایک مرحلہ رہ جاتا ہے، اس کے بعد سواد بصرہ اور اس کے سنگلاخوں (بطائح) سے ہوتا ہوا عبادان تک چلا گیا ہے۔ یہ ہیں دیار عرب کے پورے حدود جس سے یہ ملک گھرا ہوا ہے۔

عبادان سے ایلہ تک بحر فارس (بحر عرب) دیار عرب کے تقریباً تین چوتھائی علاقہ کو شامل ہے، جو عرب کا مشرقی، جنوبی اور کچھ مغربی حصہ ہے۔ اور ایلہ سے بالس کی حد ملک شام سے ہے، بالس سے عبادان تک عرب کی شمالی حد ہے، جس میں بالس سے انبار کے آگے تک ارض جزیرہ ہے، اور انبار سے عبادان تک عراق کا علاقہ ہے، ایلہ کے پاس دیار عرب سے ایک ریگستان ملا ہوا ہے، جسے تیہ بنی اسرائیل کہتے ہیں، مگر یہ ریگستان دیار عرب میں شامل نہیں ہے، بلکہ عمالقہ، یونانیوں، اور قبطیوں کی سرزمین سے ہے، اس میں نہ پانی ہے، نہ چراگاہ، البتہ چونکہ جزیرہ میں ربیعہ اور مضر کے عرب قبائل آباد ہیں اس لیے یہ دیار عرب میں سے ہے، ویسے یہ علاقہ فارس اور روم کا ہے، ان کی آبادیاں اور شہر اس علاقہ میں ہیں، ان کے اثر اور تعلق کی وجہ سے ان اطراف کے عرب قبائل نے رومیوں کا نصرانی دین قبول کر لیا، جیسے قبیلہ ربیعہ کے بنو تغلب ارض جزیرہ میں، اور یمنی قبائل غسان، بہراء، اور تنوخ اور ارض شام میں عیسائی بن گئے۔

ملک عرب کے اندرونی علاقہ میں کوئی سمندر یا دریا نہیں جس میں جہاز یا کشتی چل سکے، بحر منتنہ جسے زغر کہتے ہیں، اگرچہ بادیۃ العرب سے متصل ہے، لیکن عرب میں شامل نہیں ہے اور یمن کے دیار سبا کو نہ کوئی دریا یا سمندر نہیں تھا بلکہ پانی کو بند باندھ کر ایک نشیبی علاقہ میں روک لیا گیا تھا جسے وہاں کے لوگ اپنے باغات اور کھیتوں وغیرہ میں استعمال کرتے تھے، مگر ان کے عدوان و عصیان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے تباہ کر دیا۔[1]

---

[1] مسالک الممالک اصطخری، ص ۱۳ تا ۱۰

بحری راستوں سے عرب کے ساحلی حدود کی مسافت اس زمانہ میں کشتیوں اور جہازوں کی رفتار سے یہ تھی، عبادان سے بحرین تقریباً ۱۵ مرحلہ، بحرین سے عمان ایک مہینہ کی مسافت، عمان سے ارض مہرہ ایک مہینہ کی مسافت، مہرہ سے حضرموت ایک مہینہ کی مسافت، پھر حضرموت کے انتہائی علاقہ سے عدن ایک مہینہ کی مسافت، عدن سے جدہ ایک مہینہ کی مسافت، جدہ سے ساحل جحفہ پانچ مرحلہ، جحفہ سے جار تین مرحلہ، جار سے ایلہ بیس مرحلہ، ایلہ سے بالس بیس مرحلہ، بالس سے کوفہ بیس مرحلہ، کوفہ سے بصرہ چودہ مرحلہ، بصرہ سے عبادان دو مرحلہ یہی ساحلی مسافتیں دیار عرب کو گھیرے ہوئے ہیں۔[1]

بحرین اور عبادان کے درمیان ایک دن کا ریگستانی راستہ نہایت دشوار گذار اور بے آب و گیاہ ہے، اس لیے بحری راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے، بصرہ سے بحرین تک اٹھارہ مرحلہ کا راستہ عرب قبائل سے آباد ہے، ان کی آبادیوں میں پانی کے چشمے بھی ہیں، اس راستہ میں اگرچہ قافلے چلتے ہیں لیکن یہ خطرناک ہے، بحرین اور عمان کے درمیان کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور اس میں چلنا مشکل ہے، کیونکہ اس ریگستان میں آباد عرب قبائل آپس میں جنگ و جدال کرتے رہتے ہیں، اسی طرح عمان کے آگے خشکی کا راستہ چلنا سخت مشکل ہے، کیونکہ پورا علاقہ ریگستانی ہے اور آبادی بہت ہی قلیل ہے، اس لیے لوگ جدہ جانے کے لیے بحری راستہ اختیار کرتے ہیں، اگر ساحل سے چلیں تو مہرہ اور حضرموت سے عدن تک کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا، یہی وجہ ہے کہ یہاں پر لوگ خشکی کا راستہ بہت ہی کم اختیار کرتے ہیں۔[2]

یہ عرب کے ساحلی اور ان کے اطراف و جوانب کے مقامات کی مختصر سی فہرست اور انکی مسافتوں اور راستوں کی حالت ہے، ان ہی علاقوں میں ہندوستان کی قومیں قدیم زمانہ سے

---

[1] مسالک الممالک ص ۲۰، [2] ایضاً ص ۲۸

آتی جاتی تھیں، اور پورے علاقے میں ان کی آمد و رفت ہوا کرتی تھی، جیسا کہ آیندہ اس کی تفصیل آئے گی،

جب اسلام کی دعوت عام ہوئی تو عرب کے انتہائی علاقوں کے باشندوں کی طرح یہاں کے ان ہندوستانیوں کو بھی یہ دعوت پہنچی جو عربوں کی زندگی میں شریک ہو گئے تھے، یا وہاں آتے جاتے تھے،

ہندوستان اور عرب کے سواحل آمنے سامنے واقع ہیں اور دونوں ہی قدرت کے خصوصی فیضان کا مظہر ہیں، ہندوستان کے سواحل پر نارجیل کے باغات ہیں تو عرب کے سواحل پر کھجور کے نخلستان ہیں، حتی کہ جوز ہندی آج بھی اسی طرح مشہور ہے جس طرح عرب اور بصرہ کی کھجور مشہور ہے، اور دونوں ہی پھل دونوں ملکوں کے باشندوں کی غذا میں اہم حصہ رکھتے ہیں۔

(باقی)

ارض القرآن

حصہ اول

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد و ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے، جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی و رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق ثابت ہو جاتی ہے۔ قیمت :- للعہ

حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے ان میں مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسماعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث۔

قیمت :- بیعہ

اردو شاعری اور فن تنقید

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی مرحوم

(9)

انسانی جذبات یا احساسات میر انیس کے کلام پر مولانا نے یہاں تک جو تنقید کی ہے وہ قدیم طریقۂ تنقید کے موافق ہے، لیکن اس عنوان سے جدید طریقۂ تنقید کی ابتدا ہوتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "یہ شاعری کی اصل روح رواں ہے، اور اگر مل صاحب کی رائے تسلیم کی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے، شاعری درحقیقت مصوری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اتارنا مشکل ہے، ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کی تخئیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں، ٹہنیاں، پھل، پھول، پتے سب سامنے ہیں اور ہر شخص ان کو محسوس کر سکتا ہے، مصور کا صرف یہ کمال ہے کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچ دے، لیکن رنج، غم، جوش، محبت، غیظ، بیقراری، بیتابی، مسرت، خوشی محسوس اور مادی چیزیں نہیں ہیں، آنکھ ان کو محسوس نہیں کر سکتی، البتہ دل پر ان کا اثر ہوتا ہے، لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا، اس لیے ان کی ہو بہو اور اصلی تصویر اتارنا مشکل ہے، میر انیس کا اصلی جوہر یہیں کھلتا ہے، اور یہیں اُن کی شاعری کی حد ان کے ہمعصروں سے بالکل الگ ہو جاتی ہے،

انسانی جذبات کی سیکڑوں قسمیں ہیں، اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں،

مثلاً جذبات انسانی کی ایک اہم قسم محبت ہے لیکن محبت کے بھی مختلف اقسام اور مدارج ہیں، باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یار آشنا کی محبت، آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ، میرانیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا ذکر ہے، لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا ہے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے،

اس کے بعد مولانا نے میرانیس کے مرثیوں سے نہایت طویل مثالیں ہر قسم کے جذبات کی درج کی ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں،

مناظر قدرت، منظر یعنی سین انگریزی اور جدید اردو شاعری میں مناظر قدرت اور منظر یعنی سین کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس لیے مولانا نے میرانیس کے مرثیوں سے ان کی متعدد طویل مثالیں جمع کی ہیں، لیکن ان کے متعلق کوئی خاص تنقیدی اصول یا تنقیدی نکتہ نہیں درج کیا ہے،

واقعہ نگاری اردو میں جس چیز کی بڑی کمی ہے، وہ یہی واقعہ نگاری ہے، شاعری کی جو صنفیں اردو میں آئیں وہ قصیدہ اور غزل تھی، اور ان دونوں کو واقعہ طرازی سے کوئی نسبت نہ تھی، مثنویاں جو کچھ لکھی گئیں وہ مورخانہ نہیں، بلکہ عاشقانہ تھیں، اس لیے اصلی واقعات کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی، اردو زبان کی نسبت جو کم مایگی کی شکایت ہے وہ زیادہ تر اسی لحاظ سے ہے کہ وہ ہر قسم کے واقعات، معاملات، کاروبار، معاشرت کے جزئیات کے ادا کرنے پر قادر نہیں، اسی بنا پر اگر اردو نظم میں کوئی تاریخ کی کتاب لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے،

واقعہ نگاری کی دو قسمیں ہیں:-

(۱) واقعہ نگار کسی تاریخی واقعہ کو بے کم و کاست نظم کر دے، اس کے لیے صرف زبان

قدرت درکار ہے، شاعری کی چنداں ضرورت نہیں،

(۲) واقعہ اجمالاً معلوم ہے لیکن واقعہ نگار واقعہ کے تمام جزئیات اور حالات اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے، وہ واقعہ کی نوعیت کو دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے موقع پر فطرت کا اقتضا کیا ہے؟ ان تمام چیزوں کو وہ موجود فرض کر لیتا ہے، اور ان کو ادا کرتا ہے،

اس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے بالکل بیان واقعی ہو، اور تمام واقعات میں اس قسم کا تناسب، ربط اور موزونی ہو کہ کسی واقعہ کی نسبت شک کا احتمال بھی نہ آنے پائے، اس قسم کی واقعہ نگاری کے لیے صرف قدرت زبان دانی کافی نہیں، بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ دان درکار ہے، مثلاً شاعر احباب کی جدائی کا واقعہ لکھنا چاہتا ہے تو اس کو ان تمام جزئی کیفیتوں پر نظر رکھنی چاہیے جو اس حالت میں پیش آتی ہیں، مثلاً یہ کہ اس حالت میں ایک دوسرے کو کس حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے؟ کس قسم کی باتیں کرتا ہے؟ کن باتوں سے دل کو تسلی دیتا ہے؟ رخصت کے وقت بے اختیار کیا حرکات صادر ہوتے ہیں؟ آغاز کی کیفیت کس طرح بتدریج ترقی کرتی جاتی ہے؟ خاطر پر ان سے کیا اثر پڑتا ہے؟ پھر جدائی جدائی میں بھی فرق ہے، باپ بیٹے کی جدائی، بھائی بھائی کی جدائی، زن و شو کی جدائی، احباب کی جدائی، ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں، ان مختلف اور کثیر الانواع خصوصیات کا احاطہ کرنا اور ان کو مؤثر پیرایہ میں ادا کرنا شاعرانہ واقعہ نگاری ہے، اسی طرح لشکر کشی، معرکہ آرائی، فتح و شکست، سفر و حضر، بیماری و موت، قید و بند، دشت نوردی و بادیہ پیمائی سیکڑوں ہزاروں واقعات ہیں اور ہر واقعہ کی سیکڑوں جزئیات ہیں، ان تمام کا احاطہ کرنا اور ان کو ہو بہو ادا کر سکنا کمال شاعری ہے، واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اس کو مرقع نگاری کہتے ہیں، جس کو آجکل کی زبان میں کسی چیز کا سماں دکھانا یا سین دکھانا کہتے ہیں۔

میرانیس نے واقعہ نگاری کوجس کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے، اردو کیا فارسی میں بھی اسکی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں، ان کے کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہر قسم کے واقعات و معاملات وحالات اس کثرت سے نظم کیے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صنف باقی نہیں رہی، جوان کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو،

(۲) کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو عام نگاہیں صرف نمایاں باتوں پر پڑتی ہیں، اور اسلیے جب لوگ ان کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو انہی نمایاں باتوں کو بیان کرتے ہیں، لیکن ایک دقیق النظر ان تمام جزئیات پر بھی نظر ڈالتا ہے اور ان کو ظاہر کرتا ہے، یہ جزئیات جب ادا کیے جاتے ہیں تو سامعین پر اس طرح کا اثر پڑتا ہے گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی، اس کے علاوہ واقعہ کی پوری پوری تصویر کھنچنے سے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، یہ جزئیات اکثر شعرا، نظرانداز کرجاتے ہیں، لیکن میرانیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے رازداں ہیں، اس لیے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی ان کی نظر سے بچ نہیں سکتا، اس کے ساتھ زبان پر یہ قدرت ہے کہ کہیں ان کو دقت پیش نہیں آتی۔

مثلاً ایک موقع پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہے، قاعدہ ہے کہ گھوڑا جب حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہے تو اکثر اس کی دونوں کنوتیاں کھڑی ہوکر مل جاتی ہیں، اس کو بعینہ اس طرح ادا کیا ہے:

ع دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہوکے مل گئیں۔

یا مثلاً حضرت امام حسینؑ کے سامنے ان کے ترسانے کو جب عمرو بن سعد نے پانی منگواکر پیا ہے، اس موقع پر کہتے ہیں:

ع ظالم نے ڈگڈگا کے پیا سامنے جو آب

ڈگڈگا کے پانی پینا ایک معمولی اور غیر مہتم بالشان واقعہ ہے، لیکن ایک تشنہ لب کے ترسانے کو مضمون میں اس کا اظہار حسن بلاغت کا ایک بڑا ضروری نکتہ ہے۔

یا مثلاً ایک موقع پر گھوڑے پر سوار ہونے کی حالت کو لکھا ہے:

وہ ہاتھ ہٹ کے آپ نے رکھا ایال پر

گھوڑے سے ذرا ہٹ کے ایال پر ہاتھ رکھنا اور سوار ہونا، سواری کی مخصوص حالت ہے، اس لیے واقعہ کی تصویر کھنچنے کے لیے اس حالت کا دکھانا ضرور تھا،

اس قسم کی متعدد مثالوں کے بعد مولانا نے میرانیس کے مرثیوں سے واقعہ نگاری کی طویل مثالیں درج کی ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

رزمیہ | اردو بلکہ عربی میں بھی رزمیہ شاعری کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، اردو میں لے دے کے میر تقی ہوسؔ کے چند اشعار ہیں، جو نوفل اور لیلی کے قبیلہ کی لڑائی کے موقع پر لکھے ہیں، اس کا نمونہ یہ ہے:۔

شانوں سے گذر کے رمح چالاک
تھے ہوش ربائے مار ضحاک

مرثیہ میں میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتدا کی لیکن وہ بالکل نقش اولین تھا، میرانیس نے جس طرح اس صنف کو کمال کے درجہ تک پہنچایا اس کے لحاظ سے اردو شاعری گو فارسی کی برابری کا دعوی نہیں کرسکتی لیکن عربی سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

رزمیہ شاعری کا کمال امور ذیل پر موقوف ہے، سب سے پہلے لڑائی کی تیاری، معرکہ کا زور شور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہل چل، شور وغل، نقاروں کی گونج، ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، نقیبوں کا گرجنا، ان چیزوں کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ

کا سماں چھا جائے، پھر بہادروں کا میدانِ جنگ میں جانا، مبارز طلب ہونا، باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤں پیچ دکھانا ان سب کا بیان کیا جائے، اس کے ساتھ اسلحۂ جنگ اور دیگر سامان جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے، پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ دل ہل جائیں، یا طبیعتوں پر اداسی اور غم کا عالم چھا جائے۔

اس کے بعد مولانا نے متعدد عنوانات قائم کرکے میرانیس کے مرثیوں سے رزمیہ شاعری کی عمدہ مثالیں جمع کی ہیں،

معائب میرانیس کے محاسن کلام کے بعد مولانا نے میرانیس کے معائب بھی دکھائے ہیں، پہلے تو ان لفظی اعتراضات کو مع جواب کے نقل کیا ہے، جو مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے میرانیس پر کیے تھے اس کے بعد خود بہت سے لفظی اعتراضات کیے ہیں، لفظی غلطیوں کے سوا معنوی حیثیت سے بھی بہت سی باتیں قابل اعتراض ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) اکثر جگہ مصرعوں میں باہم ربط نہیں ہوتا اور صاف نظر آتا ہے کہ دوسرا مصرعہ برجستہ نکل آیا تھا، اس کے لیے زبردستی قافیہ اور ردیف کی رعایت سے اوپر کا مصرعہ پیوند کیا ہے، اس کی متعدد مثالیں دی ہیں، اور لکھا ہے کہ اس قسم کے سیکڑوں اشعار اور ہیں۔

(۲) اکثر جگہ لفظی رعایت کی وجہ سے کلام اوچھا اور بے اثر ہو گیا ہے، مثلاً ان اشعار میں نہایت مبتذل طریقہ سے لفظی رعایت کو صرف کیا ہے:

ع بولے نہنگ خوب نہیں یہ اگر مگر

ع سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

اس قسم کی متعدد مثالیں جمع کرکے لکھا ہے کہ ان تمام اعتراضات کا صرف یہ جواب ہے کہ لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ کا خمیر بن گیا تھا، باقی عیوب لازمۂ انسانی ہیں،

اور کسی بشر کا کلام ان سے پاک نہیں ہو سکتا،

سرقات اگرچہ میرانیس کے بہت سے اشعار پر سرقہ کا گمان ہو سکتا ہے لیکن مولانا کے نزدیک اگر کسی شاعر کے مضمون کو لیکر اس کو ترقی دیدیجائے تو اس کو سرقہ نہیں کہہ سکتے، اور میرانیس کے ہاں جو سرقے پائے جاتے ہیں اکثر اسی قسم کے ہیں، لیکن بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہے بلکہ کسی فارسی شعر کو بعینہ لے لیا ہے، اس قسم کے مضامین کو حسن ظن ہو تو توارد ورنہ سرقہ کہنا چاہیے،

میرانیس اور مرزا دبیر کا موازنہ مولانا نے میرانیس اور مرزا دبیر کا جو موازنہ کیا ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے مرزا دبیر کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں، خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے، لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں، وہ نہایت پُرگو تھے، ان کے اشعار کا شمار ہزاروں کیا لاکھوں تک ہے، اخیر اخیر میں وہ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے، اس بنا پر ان کے کلام میں جا بجا شاعری کے لوازم اور خاصے پائے جاتے ہیں، لیکن گفتگو قلت اور کثرت میں ہے، میرانیس کے بہت سے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا حصہ بہت کم ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے نسبتہً کس کا کلام شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے،

اس اجمالی رائے کے بعد مرزا دبیر کے کلام کے جو معائب دکھلائے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

فصاحت۔ مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت اور شستگی نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہے، اور اس کے مختلف اسباب ہیں،

(۱) مرزا صاحب اکثر ثقیل اور غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً

ع مدعی شق القمر آ کر ہوئے گمراہ

ع خاص الخلاصہ بنی آدم کمال میں

ع مستجمع جمیع فضائل ملک سیر

(۲) بعض الفاظ بجائے خود ثقیل اور گراں نہیں لیکن مرزا صاحب جن ترکیبوں کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں ان سے نہایت ثقل اور بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے، مرزا صاحب کے کلام میں اس قسم کی ناموزونی نہایت کثرت سے ہے اور مولانا نے انکی متعدد مثالیں جمع کی ہیں جن میں چند یہ ہیں:

ع اک شخص کمر شہ کی لگا باندھنے خورسند

ع ملبوس قلمکار نہ دوں ہے نہ پرانا

ع یہ صورت پیغمبر قوسین مکان ہے

بندش کی سستی اور ناہمواری۔ میرانیس کا اصلی جوہر بندش کی چستی، ترکیب کی دلآویزی، الفاظ کا تناسب اور برجستگی و سلاست ہے، اور یہ چیزیں مرزا صاحب کے ہاں بہت کم ہیں، ایک ہی مصرع میں ایک لفظ نہایت بلند اور شاندار ہے، دوسرا مبتذل اور پست ہے، بند کا ایک شعر اس زور شور کا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرجتا آ رہا ہے، دوسرا بالکل پھیکا اور کم وزن ہے، دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہیں، پھر تعقید اور بے ربطی شروع ہو جاتی ہے، اکثر جگہ الفاظ بڑی دھوم دھام کے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں، اس کے بعد مولانا نے کئی صفحوں میں نہایت کثرت سے اس کی مثالیں جمع کی ہیں، ان میں سے ہم صرف ایک مثال پر قناعت کرتے ہیں:

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے — اے طنطنۂ طبع جز و کل کو ملا دے

اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے — اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلہ دے

اے بائے بیابان معنی تسخیر کو حل کر

اے شین سخن تان سے تا قاف عمل کر

کیسے پر رعب الفاظ ہیں لیکن معانی میں بہت کم ربط ہے، طنطنہ کو جزو کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے؟ زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟ بیان کی لے کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟

تعقید۔ مرزا صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت تعقید بھی ہے، وہ جہاں معنی آفرینی اور دقت پسندی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں، کلام میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہ نہایت دقیق اور بلند مضامین پیدا کرتے ہیں لیکن مناسب الفاظ ہاتھ نہیں آتے، اس لیے مضمون ایک گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتا ہے، مثلاً تلوار کی تعریف میں کہتے ہیں:

نگہ چشم نیام اوج پہ آیا — اور عیاں ہر اک فرد و بشر کو نظر آیا

خط کھینچنے کو کلک دوات ظفر آیا — یا ڈھونڈ کے ظلمت کی گلی سے خضر آیا

واں شور تھا پیدا مہ نو سے مہ نو ہے

یاں غل تھا جدا شمع سے یہ شمع کی لو ہے

تشبیہات و استعارات۔ مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ وہ اپنی دقت آفرینی سے ایسی عجیب اور نادر تشبیہات و استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا، لیکن اس زور میں وہ اکثر اس قدر بلند اڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں، مولانا نے اس قسم کی تشبیہات و استعارات کی بکثرت مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے جمع کی ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

شمشیر نے جل تھل جو بھرے قاف سے تا قاف — پریاں ہوئیں مرغابیاں گرداب ہوا قاف

چھپنے کیلئے خوف سے اس درجہ گھٹا قاف
جو بیچ میں سیمرغ کی منقار کے تھا قاف

فلک نے تختۂ یونان رکھا زمیں کا نام
ہوا رطوبتِ اطراف سے زمیں کو زکام

اسلام میں جو ڈالے ہیں رخنے یزید نے
ان رخنوں کو کیا پر زرہ تن پلید نے

پانوں میں پہنے موزۂ گمراہی جہاں
کج فہمی معاویہ کی اس نے لی کماں

مختصر یہ کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں مرزا صاحب کا جواب نہیں، لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے، کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے، تشبیہات کہیں پہیلیاں بن جاتی ہیں اور کہیں محض فرضی خیالی رہ جاتی ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے ان کے عمدہ کلام کی بکثرت مثالیں درج کی ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت حذف کرتے ہیں۔

بلاغت۔ یہ وہ چیز ہے جہاں انیس اور دبیر کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں، مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔

تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ ہر چیز کی بلاغت الگ ہے، مضمون کی الگ، قصہ کی الگ شعر کی الگ، لیکن مرزا صاحب کے کسی قسم کے کلام میں یہ وصف نہیں پایا جاتا، وہ اگر کسی واقعہ کا خاکہ تیار کرتے ہیں تو اس قسم کی باتیں بیان کرتے ہیں جو خود شہادت دیتی ہیں کہ واقعہ وجود میں نہیں آسکتا تھا، نوحہ و غم، فخر و ادعا، طنز و تشنیع، ہجو و بدگوئی، سوال و جواب، گلہ و شکایت غرض کسی مضمون کو وہ مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے۔

اس کے بعد مولانا نے اس کی متعدد مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے جمع کی ہیں، جن میں دو ایک یہ ہیں:

(۱) ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین علیہ السّلام کی شہادت پر حضرت شہربانو کا جو نوحہ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

تم جانو جہاں سے شہِ عالی کو لے آؤ
اکبر سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

"تم جانو جہاں سے" اس محاورہ کے ابتذال سے قطع نظر کرکے یہ امر کس قدر خلاف مقتضائے حال ہے کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کردو،

(۲)
محبوب ہوں خدا اے ذوی الاحترام کا
نانا ہوں میں حسین علیہ السّلام کا

یہ شعر جناب رسول خدا کی زبان سے ادا کیا ہے، لیکن مرزا صاحب کو یہ خیال نہیں رہا کہ کیا آنحضرتؐ بھی امام حسین علیہ السلام کا نام علیہ السلام کہکر لیتے تھے۔

ان تمام مثالوں کے بعد مولانا نے اخیر میں لکھا ہے کہ اس کے بعد متحد المضمون مرثیوں کا جو عنوان ہے اس سے تفصیلاً معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب بلاغت کی راہوں سے کس قدر ناآشنا ہیں۔

تصحیح واستدراک

از جناب مولانا غلام رسول صاحب مہر مسلم ٹاؤن لاہور

۲۵ فروری ۱۹۶۲ء

کرمی جناب شاہ صاحب!

فروری کا معارف "کل ملا، حضرت مجددؒ پر جو مقالہ پروفیسر مسعود احمد صاحب نے تحریر فرمایا وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے، مگر تعجب ہے، ممدوح کو تاریخ مبارک شاہی کے متعلق غلط فہمی ہوئی (فروری صفحہ ۹۴) یہ کتاب خواجہ محمد یحییٰ بن حضرت مجددؒ کی نہیں، بلکہ یحییٰ بن احمد بن عبد اللہ کی ہے، یقیناً وہ سرہندی تھے، مگر دوسرے شخص تھے، جو کم وبیش دو سو سال پیشتر گزرے، حضرت مجددؒ کے والد ماجد کا اسم گرامی عبد اللہ نہیں، عبد الاحد تھا، مصنف مبارک شاہی نے خود لکھا ہے کہ جب سید مبارک شاہ تخت نشین ہوا تو میں اس کے پاس جانا چاہتا تھا، کوئی موزوں تحفہ موجود نہ تھا، یہ تاریخ لکھ کر لے گیا، مبارک شاہ کا سنہ جلوس ۸۲۴ھ ہے، اور ۸۳۷ھ میں وہ مارا گیا، خواجہ محمد یحییٰ کی تاریخ ولادت ۱۰۲۳ھ ہے، یقین ہے کہ پروفیسر صاحب باپ بیٹے کے ناموں میں اشتراک کے باعث غلط فہمی کا شکار ہوئے، اس پر وطنیت کا اشتراک مستزاد ہوا، اور وہ دوسرے متعلقہ امور پر غور نہ فرما سکے۔

یہ عریضہ اشاعت کے لیے نہیں بھیج رہا ہوں، آپ کی خدمت میں گزارش پیش کر دینا کافی ہے، اگر یہ گزارش درست ہو تو آپ خود ایک دو سطروں میں اپنی طرف سے تصحیح فرما دیں۔

"بیاض باطنی" والے مضمون میں صفحہ ۹۴ پر محمد حسین صاحب کی جو فارسی عبارت شائع ہوئی ہے، میرا احساس یہ ہے کہ وہ ٹھیک نہیں پڑھی جا سکی، محرر موصوف کا مقصود یہ تھا کہ بیاض جس تاریخ کو سید غلام علی آزاد بلگرامی کے پاس پہنچی (۱۱۶۸ھ) اس سے ۱۲۹۶ھ تک ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) سال گزر چکے ہیں، مگر منقولہ عبارت اس ایضاح کے لیے کافی معلوم نہیں ہوتی، اسی طرح آزاد بلگرامی کی عمر غالباً چوراسی سال آٹھ مہینے بنتی ہے، نہ کہ چھیاسی (۸۶) سال، جیسا کہ صفحہ ۱۳۴ پر مرقوم ہے۔

ہم دور افتادہ مساکین آپ کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، جس عزم وہمت سے آپ نے قومی اور ملکی مسائل ومصالح کی خدمت انجام دی اور انجام دے رہے ہیں، اس کے لیے عند اللہ ماجور ہوں گے، آپ کو قدرت نے جس مقام پر کھڑا کیا ہے، اس کے فرائض ادا کرنا سہل نہیں، لیکن آپ نے تمام فرائض احسن طریق پر ادا کیے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور آپ کا یار وناصر ہو۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نیاز مند

مہر

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے مملوک یعنی غلام سلاطین، امراء، اور شہزادوں کی علم نوازی اور معارف پروری کے حالات اور ان کے درباروں سے متوسل علماء، فضلاء اور ادباء کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

(مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے) قیمت :- ۵ روپے صفحات ۳۶۴

ادبیات

رہروانِ حرم

از زائرِ حرم جناب حمید صدیقی لکھنوی

زیدِ لطف و کرم سنکے خاص و عام چلے
کشاں کشاں بدرِ رحمتِ تمامؐ چلے

حضورِ ساقیِ کوثرؐ تشنہ کام چلے
بفیضِ شوق و طلب میکدہ بجام چلے

نظر نظر کو بنائے ہوئے پیام چلے
نفس نفس میں لیے ہدیۂ سلام چلے

جلو میں لیکے مرادوں کا اژدحام چلے
عجیب شان سے سرکارؐ کے غلام چلے

زرق آہ بہ قدم سرخوشی و مدہوشی
نسیمِ صبح کے مانند خوش خرام چلے

کبھی کمالِ ادب سے قدم اٹھا نہ سکے
کبھی وفورِ محبت میں تیز گام چلے

نہ رک سکے کسی عالم میں عازمانِ حرم
سحر کے وقت چلے کچھ قریبِ شام چلے

جو منتجیٔ نسیمِ کرم تھے مدت سے
وہ لے کے خود دلِ پُرشوق کا پیام چلے

ہنر و کیفِ تصور میں کھوئے کھوئے سے
خراب حال حضورِ شہِ انامؐ چلے

جنھیں صنم کدۂ دہر میں اماں نہ ملی
وہ جانبِ حرمِ سیدالکرامؐ چلے

رہِ طلب کے مزے کچھ وہی اٹھائینگے
جو منزلوں پہ بھی کرتے ہوئے قیام چلے

وہ اہلِ دل کا یکے بعد دیگرے بڑھنا
کہ جیسے بادۂ عرفاں کا دور جام چلے

حبیب پاکؐ کے روضے کی جالیوں کی طرف
دلوں میں لیکے تمنائے استلام چلے

پئے سلام مواجہ کی سمت یوں بڑھنا
کہ جیسے بادِ بہاری سبک خرام چلے

دیارِ پاک حبیبِ خدا میں لازم ہے
قدم قدم بصد آداب و احترام چلے

حمیدؔ عید ہے ان رہروانِ طیبہ کی
جو لوٹنے کو بہارِ مہِ صیام چلے

مطبوعات جدیدہ

ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر } مرتبہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، لمبی تقطیع، کاغذ معمولی، صفحات ۳۶۸، قیمت ہے، پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور، پاکستان۔

ترجمان القرآن کا یہ خاص نمبر جو منکرین حدیث کے رد اور ان کے اعتراضات کے جواب میں نکالا گیا ہے، دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر عبدالودود کے درمیان سنت کی آئینی حیثیت کے متعلق پوری مراسلت درج ہے جس میں ان کے سوالات اور اعتراضات کا پورا جواب دیا گیا ہے، اور دوسرے میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جسٹس محمد شفیع صاحب کا وہ فیصلہ نقل کیا گیا ہے جس میں فاضل جج نے بڑی تفصیل کے ساتھ اسلام میں قانون سازی کے طریق اور قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی قانونی ماخذ تسلیم کیے جانے کے بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے اور اس پر مولانا مودودی کی مفصل و مدلل تنقید۔ اس طرح اس نمبر میں منکرین حدیث کے جوابات کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، اور انکار حدیث کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اس نمبر میں مل جاتا ہے، اور خود مولانا کی ذہانت نے بھی بعض نئی باتیں پیدا کی ہیں جن میں ان کی متکلمانہ شان نمایاں ہے، یہ نمبر اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے ہاتھوں تک پہنچایا جائے۔

نیرنگ معانی ۔ از جناب تلوک چند محروم، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت عمدہ، صفحات ۱۹۶، مجلد قیمت للعہ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔

نیرنگ معانی اردو کے نامور استاد سخن جناب تلوک چند محروم کے کلام کا نیا اور تازہ مجموعہ ہے جو ان کی ادبی اور نیچرل نظموں پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں کچھ نظمیں خدا کی حمد کے متعلق ہیں، اس کے بعد مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے بزرگوں کے دلنشین اقوال اور سبق آموز واقعات کو نظم کیا گیا ہے، اور آخر میں شاعر نے جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی تصویر کشی کی ہے، جناب محروم کا کلام تعارف سے مستغنی ہے، ان کے کلام کی تمام خصوصیات اس مجموعہ میں بھی موجود ہیں۔

اعجاز القرآن ۔ از جناب محمد افضل شریف صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۴، قیمت حسب استطاعت، پتہ: محمد افضل شریف، مبلغ اسلام ۱۴۵ پنشن، لین، بورین پلی، حیدر آباد دکن ۱۰۱

قرآن مجید اپنی زبان، الفاظ، طرز بیان، تاثیر کلام، نزول، جامعیت اور مصئونیت وغیرہ مختلف پہلوؤں سے سراپا اعجاز ہے، اس کتاب میں کلام مجید کی ان ہی حیثیتوں پر مختصر اور سرسری بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اردو اور عربی دونوں میں اتنا مواد موجود ہے کہ اگر اس کو سلیقہ کے ساتھ اکٹھا کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر اور مفید ہوتا، تاہم مصنف کی یہ محنت اور کوشش بھی قابل ستائش ہے، بعض مباحث سے ان کی جدت و ذہانت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

انتظام کتب خانہ ۔ از جناب شیخ محبوب قریشی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت اچھی، صفحات ۸۴، قیمت: عہ، پتہ: محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، حیدر آباد کالونی ۱/۲ کراچی ۵

شیخ محبوب قریشی صاحب مالک و موسس محبوبیہ کارخانہ جلد سازی نے تقسیم ملک سے پہلے یہ مفید رسالہ تحریر کیا تھا، مگر اب وہ نایاب تھا، اس لیے انھوں نے اسے مزید اضافے اور نئے معلومات کے ساتھ شائع کیا ہے، اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے، مصنف کو اس فن سے خاص مناسبت اور اس کا ان کو ذاتی تجربہ ہے، اس لیے انھوں نے اس میں کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم، عمارت و زیبایش اور کتابوں کی حفاظت، ترتیب اور جلد سازی وغیرہ کے متعلق سادہ اور عام فہم زبان میں قیمتی اور مفید مشورے دیے ہیں، اس کا مطالعہ کتب خانوں کے مالکوں اور منتظمین کے علاوہ عام اصحاب ذوق کے لیے بھی مفید ہے۔

مسلمان اور ہندوستانی پوروج ۔ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶، قیمت درج نہیں، ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کا یہ مقالہ اس مشورہ کا جذباتی ہم آہنگی کمیٹی کے چیرمین اور یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند نے ہندوستانی مسلمانوں کو دیا تھا کہ "وہ بڑے بڑے ہندوستانی سپوتوں کو اپنا اجداد تسلیم کریں اور ان کی تنظیم کریں اور ان کے کارناموں پر فخر کرنا سیکھیں"، بڑا عالمانہ اور مدلل جواب ہے۔ یہ جواب اتنا سنجیدہ اور اتنا مدلل ہے کہ اسے پڑھ کر خود سمپورنانند جی کو بھی اپنی بعض غلطیوں کا اعتراف کرنا پڑا تھا۔

انمول موتی ۔ از جناب مفتی فخر الاسلام صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۲ قیمت ۶۲ نئے پیسے، پتہ: ادارہ انیس اردو الہ آباد ۳

قرآن مجید اور حدیث نبوی کے ان ٹکڑوں کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ ہے جو قیامت کی ہیبت، فضائل اخلاق کے حسن و خوبی اور رذائل کی مذمت وغیرہ سے متعلق ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب اسم بامسمی ہے۔

"ض"

فارم ۴

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	......
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۸۹ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۲ء، عدد ۴

مضامین

مقالات